اصحاب الیمین ما اصحاب الیمین
و
اصحاب الشمال ما اصحاب الشمال

رجال فکر و نظر

تحقیق و تصنیف

فیلسوف اسلام علامہ عدیل اختر اعلی اللہ مقامہ

تہذیب و تذہیب

حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا میثم زیدی

RIJAAL-E-FIKR-O-NAZAR

By : Allama Adeel Akhtar

فہرست کتب مطبوعہ از علامہ

- تسکین الفتن فی صلح الحسن
- دعوۃ النظر الی خلافۃ خیر البشر
- تدریس شبلی
- فلسفۂ اسلام یا علم کلام
- علمی خیانتیں
- رجال فکر و نظر
- مسئلہ تقیہ
- صلۂ تاریخ احمدی

ناشر

مکتبۂ افادات علامہ عدیل اختر اعلی اللہ مقامہ

۵۴۶/۱۳۰ سرفراز گنج لکھنؤ-۳ (ہندوستان)

موبائل: ۹۴۱۵۳۹۵۴۹۲ و ۹۴۳۱۰۷۳۳۳۳

سلسلۂ اشاعت آثار فیلسوف اسلام علامہ عدیل اختر (۱)

اصحاب الیمین ما اصحاب الیمین
و اصحاب الشمال ما اصحاب الشمال

رجال فکر و نظر

تحقیق و تصنیف

فیلسوف اسلام علامہ سید عدیل اختر زیدی اعلی اللہ مقامہٗ

۱۳۱۵ھ —— ۱۳۷۰ھ

(سابق پرنسپل مدرسۃ الواعظین لکھنؤ)

تہذیب و تذہیب

حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا میثم زیدی

نام کتاب.................................رجال فکر و نظر
تحقیق و تصنیف........فیلسوف اسلام علامہ عدیل اختر اعلی اللہ مقامہٗ
تہذیب و تذہیب.......................حجۃ الاسلام مولانا میثم زیدی
کمپوزنگ...........................مولانا سید نشین حیدر رضوی
پروف ریڈنگ..............................مولانا کامل رضا
تاریخ طباعت...............................جنوری ۲۰۱۲ء
ناشر.........................مکتبۂ افادات علامہ عدیل اختر
ایڈیشن...بار اول
مطبع...............................امپریشن پرنٹنگ پریس لکھنؤ
تعداد...ایک ہزار
قیمت...ایک سو روپے

(طباعت کے تمام حقوق ناشر کے لئے محفوظ ہیں)

ملنے کے پتے

۱۔ میثم زیدی 546/130 نزد ارا میڈیکل کالج
سرفراز گنج لکھنؤ۔226 003 رابطہ 9415395492

۲۔ دفتر ماہنامہ "اصلاح" مسجد دیوان ناصر علی
مرتضیٰ حسین روڈ لکھنؤ۔226 003 رابطہ 522-2261954

۳۔ ڈاکٹر جون زیدی
اورینٹل کالج پٹنہ۔800 008 رابطہ 9431073233

۴۔ صحیفہ بک سینٹر
وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ۔226 003 رابطہ 9415152648

فہرست

۱۔	ابتدائیہ	۵
۲۔	تقریظ	۷
۳۔	حیات بخش ذکر	۱۳
۴۔	ابتدا کتاب	۳۵
۵۔	محبت وعداوت کا معیار	۳۶
۶۔	سچی اور جھوٹی محبت وعداوت	۳۷
۷۔	کھرے اور کھوٹے میں تمیز کی ضرورت	۳۸
۸۔	قرآن مجید میں محبت وعداوت کا امر	۳۹
۹۔	احادیث اور حب وبغض کا حکم	۴۰
۱۰۔	محبت وعداوت میں احتیاط لازم ہے	۴۳
۱۱۔	اصحاب اور ان کی محبت اور عداوت کا مسئلہ	۴۴
۱۲۔	مساوات وعدم مساوات	۴۶
۱۳۔	سرور کائنات اور دیگر انبیاء	۴۹
۱۴۔	کسی کی تعلیم جبری نہ تھی فقط تعلیم دینا فرض تھا	۵۰
۱۵۔	سرور عالم اور نبی بنی اسرائیل کی تشبیہ	۵۲
۱۶۔	حدیث میں بنی اسرائیل اور اس امت کی تشبیہ	۵۴
۱۷۔	صحابی یا اصحاب کس کو کہتے ہیں	۵۶
۱۸۔	صحابہ	۶۶
۱۹۔	عدالت صحابہ	۷۲
۲۰۔	عدالت صحابہ شبہہ اور اسکا جواب	۸۷
۲۱۔	حالات مصنفؒ	۹۱
۲۲۔	تصانیف علامہ عدیل اخترؒ	۹۷

ابتدائیہ

جد امجد فیلسوف اسلام علامہ سید عدیل اختر اعلی اللہ مقامہ کی ذات گرامی اوران کے علمی خدمات صاحبان نظر کے لئے محتاج تعارف نہیں۔ان کے قلم نے ہمیشہ فکر انگیز اور اچھوتے موضوعات کا انتخاب کیا ہے۔ان کی مشہور کتابیں صلح الحسن، تدلیس شبلی، مسئلہ تقیہ، علمی خیانتیں، صلۂ تاریخ احمدی، دعوۃ النظر الی خلافۃ خیر البشر، فلسفۂ اسلام یا علم کلام وغیرہ علماء وافاضل کے لئے علمی استفادہ کا ذریعہ بن چکی ہیں۔

زیر نظر کتاب جسکا عنوان آیۂ "اصحاب الیمین ما اصحاب الیمین و اصحاب الشمال ما اصحابُ الشمال" ہے اور علامہ موصوف نے قبل اسکے کہ کتاب کا کوئی نام رکھتے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا لہٰذا اب جبکہ اس کتاب کی اشاعت ہونے جارہی ہے میں نے استاذی العلام مولانا محمد شاکر صاحب قبلہ سے تقریظ لکھنے اور اس کتاب کا مختصر نام رکھنے کی درخواست کی تو انہوں نے جو کہ اس وقت میری دانست میں علامۂ مرحوم کے شاگردوں کی فہرست میں آخری فرد ہیں اس کتاب کا نام "رجال فکر و نظر" رکھا یہ کتاب پہلی بار طبع ہو کر شائع ہونے جارہی ہے۔اور اپنی علمی کم مائگی اور جد امجد سے نسبت فرزندی مجھے اجازت نہیں دیتی کہ آپ کی علمی عظمت اور قلمی جلالت کے بارے میں کچھ اظہار خیال کرسکوں پروردگار سے دعا ہے کہ علامہ مرحوم کو ان کے دینی خدمات کا بے پایان

صلہ مرحمت فرمائے۔اور مجھے توفیق دے کہ انکے علمی ورثہ کی حفاظت نیز انکی اور دیگر محققین وعلماء کی تحریروں کو تشنگان علم وتحقیق تک پہنچانے کا فریضہ ادا کرسکوں۔

شکر گزار ہوں اپنے استاد محترم استاذ الاساتذہ، فیلسوف عصر، حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید محمد شاکر نقوی صاحب قبلہ دام ظلہ العالی کا جنہوں نے اپنی تقریظ کے ذریعہ میری ہمت افزائی کی۔

نیز شکر گزار ہوں ان تمام حضرات کا، جنکے تعاون کے بغیر اس کتاب کی اشاعت ممکن نہ تھی خاص طور سے ولایت فاؤنڈیشن کا جسکا جزوی تعاون اس کتاب کی اشاعت کا معاون ہے اور میں اس جگہ برادران محترم ڈاکٹر جون زیدی و ڈاکٹر ابو طالب زیدی و ہمشیرہ گرامی معظمہ اخلاق خواہر رباب زیدی کا تذکرہ ضروری سمجھتا ہوں کہ جن کی قدم بہ قدم حوصلہ افزائی مختلف خدمات کی محرک بنتی رہتی ہے۔

آمین

خاکسار

میثم زیدی

۱۷ ربیع الاول ۱۴۳۲ھ

تقریظ

ازاستاذالاساتذہ،فیلسوف عصر حجۃ الاسلام والمسلمین

مولانا سید محمد شاکر نقوی صاحب قبلہ دامت برکاتہ

استاد جامعہ ناظمیہ لکھنو

تقریظ کی افادیت اور منشا عموماً، یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ صاحب تصنیف یا تالیفات کی شخصیت عوام کے لئے اجاگر ہوجائے اس غرض کے لئے ایسی شخصیت تلاش کی جاتی ہے۔ جو مصنف کی عظمت شناسی کے لئے موزوں ہو سرکار استاذ ی العلام کی جلالت پناہ ذات اقدس خود تبحر علمی کے لئے اپنے معاصرین کے واسطے ضمانت ہے۔ بھلا ان کی ذات کسی کی محتاج تعارف نہیں۔ ہاں بس یہ سوچا جا سکتا ہے کہ اپنے شرف انتساب میں چار چاند لگ جائیں گے۔ چنانچہ یہی بات سوچ کر تقریظ کا تصور کر کے دل کو سکون حاصل ہوا اور ہاتھ قلم کی طرف بڑھا ورنہ پورے ماحول پر جو سرکار مرحوم کا رعب وداب چھایا ہوا تھا اس کا ایک ہلکا سا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جامعۂ ناظمیہ کے ورجہ قابل کی دہشت کا عالم طلاب پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ ہم طلاب کو یقین ہو گیا تھا کہ قابل میں فرسٹ ڈویژن تو آنا ہی محال ہے۔ اپنے عہد میں صرف پارہ چنار کے مولانا میر حسن جان صاحب قبلہ قابل

میں فرسٹ آئے تھے۔ یہ باتیں سن کر اور خوف ودہشت ہوئی کہ پھر ہمارا کیا حشر ہوگا۔ منطق میں ملا جلال کا علم ہیئت میں تصریح کا خیال کر کے ہوش وحواس گم تھے۔ سب سے زیادہ دہشت تصریح کے پرچے کی تھی کیوں کہ سنا تھا کہ حضرت مولانا عدیل اختر صاحب قبلہ کا پرچہ ہوتا ہے۔ خدا خدا کر کے امتحان ختم ہوا۔ تصریح کے پرچہ کی ہیبت سوار تھی پرچہ اطمینان بخش تھا لیکن جیسی امید تھی ویسا ہی پیچیدہ بھی تھا۔ نتیجہ سے فکر ضرور تھی مگر شخصیت کا خیال کر کے اطمینان تھا کہ ناانصافی ناممکن ہے۔ چنانچہ وہی ہوا کہ تصریح کے پرچے میں اسی ۹۰ نمبر میرے اور اسی ۸۰ نمبر مولانا علی عابد صاحب کے تھے۔ اسی نتیجہ ہی کی وجہ تھی کہ سرکار مولانا صاحب قبلہ نے ہم دونوں کو حمد اللہ پڑھانے کی بات منظور فرمائی۔ حمد اللہ جس شان سے پڑھنے کو مل گئی کہ اپنی قسمت پر ناز کرنا پڑتا ہے حمد اللہ کا لطف آگیا اور اندازہ ہوا کہ یہ علم کا سمندر واقعاً ایسا ناپید کنار ہے کہ جس کا تصور ناممکن ہے۔ مختصر یہ کہ جلالت علمی کا ایسا رعب ودبدبہ چھایا کہ پورے علمی ماحول میں مولوی صاحب قبلہ کے علاوہ کوئی نظر بھی آیا تو کوئی ذرا نظر میں نہ سمایا۔

چنانچہ جب قابل کی سند پر دیگر علماء کرام کی تصدیق کا مسئلہ آیا تو مولوی علی عابد کے ساتھ میں نے بھی یہی فیصلہ کیا کہ مولوی صاحب کی تصدیق کے بعد ہمیں کسی کی ضرورت نہیں بلکہ مولوی صاحب قبلہ کی تصدیق کے بعد ہمیں کسی کی تصدیق حاصل کرنا خود مولوی صاحب قبلہ کی اہانت کا مرادف قرار پاتا ہے۔ چنانچہ مولوی علی عابد صاحب کی سند کے سلسلہ میں وثوق سے دعویٰ نہیں کر سکتا البتہ میری سند میں سوائے مولوی صاحب قبلہ کی تصدیق کے آج تک کسی اور کی تصدیق نہیں ہے۔ اب اس کے بعد میرے دل کی کیفیت کا کون اندازہ لگا سکتا ہے کہ تقریظ کے واجبی فریضہ کو

کیسے اور کیوں کر انجام دیا جائے۔

جہاں تک ذاتی تاثرات کا تعلق ہے خود قیاس کیا جا سکتا ہے کہ فکر کی ہر ہر منزل پر ارتعاش کا کیا حال ہوگا۔ ہاں البتہ عقیدت میں غلو کا الزام لگایا جا سکتا ہے لیکن وہ غلو بھی صرف میری ذات تک محدود ہو سکتا ہے لیکن یہ سارا زمانہ تو صاحب فکر ونظر ہے دلیل کے نتیجے تو کل جہان فکر کے لئے آزاد ہیں اس کے سامنے تو ہر صاحب فہم وادراک کی عقل حقیقت کی رہنمائی کے لئے موجود ہے۔ اہل بصیرت خود انصاف کی عینک لگا کر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ استدلال کس منزل پر پہونچ رہا ہے، کیا چاہتا ہے۔ یوں تو سرکار استاد علام کی تمام کتابیں ایک سے ایک بڑھ کر موجود ہیں کہ جس میں کسی کو ایک پر دوسرے کو ترجیح کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کیوں کہ جہاں دو ۲ اور دو ۲ چار ۴ کے نتیجے ہوں گے وہاں ہر کھلے ذہن رکھنے والا یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہے کہ حق کیا ہے۔ چنانچہ **خلافة خير البشر** کو ہر دیکھنے والا یہ فیصلہ کرے گا کہ استدلال کیا کہہ رہا ہے۔

اس کے بعد منزل آتی ہے صحابۂ کرام کی کیوں کہ حق کا منحصر انحصار انہیں حضرات کی ذات پر ہونا ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے لیکن یہ بھی حق ہے کہ شیطان نے ایسے نازک موقعوں کے لئے عزت خداوندی کی قسم کھا کر کہا تھا **فبعزتک لا غوينهم اجمعين** لہٰذا اس نے اپنے ہی متبعین کو حق سے ہٹا دیا۔ ہوا کیا کہ شیطان نے اپنے من مانے گندے افراد جن کے نجس وداغدار دامن کو دھونا ممکن نہیں ان کو صحابی رسول اکرم کے پاک وپاکیزہ شرف سے مشہور کردینے کا منصوبہ بنا لیا اور ولید جیسے علی الاعلان گناہ گار حالت نشہ میں نماز پڑھانے والے کو صحابی رسول منوا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا آج تک یہ طے نہ کر سکی کہ حضور اکرم کی حقیقی صحابیت کا معیار کیا ہے؟

استاذی العلام نے حقانیت کی پوری پوری وضاحت فرما کر مغالطہ کی نشاندہی بھی فرمادی تا کہ فکر ونظر رکھنے والے بھول کر بھی ٹھوکر نہ کھا سکیں لیکن جن لوگوں کو شیطان کے قسم کی لاج رکھنا تھی ان لوگوں نے ڈٹ کر قسم کی لاج رکھی مگر یہ بھول گئے کہ شیطان نے اپنی قسم میں الّا کی گنجائش رکھی ہے۔ **فبعزتک لا غوينهم اجمعين الا عبادک منهم المخلصين** تیری عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ضرور بالضرور ان سب کو بہکاؤں گا مگر جو تیرے مخلص بندے ہیں ان کو نہ بہکا سکوں گا اور یہ بھی بھول گئے اللہ نے شیطان کی قسم کا جواب بھی شد ومد کے ساتھ دیا ہے

قال فالحق والحق اقول لاملئن جهنم منک وممن تبعک منهم اجمعين.

اللہ نے فرمایا ٹھیک ہے اور میں بھی حق ہی کہتا ہوں کہ میں بھی جہنم کو تجھ سے اور تیری اتباع کرنے والوں سے بھر دوں گا۔

مجھے استاذی العلام کی ہمدردانہ انصاف پسند تحریر سے متاثر ہونے والے افراد کے بارے میں یقین ہے کہ انہیں ضرور تلاش حق کے متوالوں کی طرح حق مل کر رہے گا۔ کیوں کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم ہی حق تلاش کرنے والوں کے لئے واقعی حق کی کسوٹی ہو سکتے ہیں۔ اگر چہ ان کی عظمت ان کے لئے تقدس کو خود غرضی کی سیاسی روش نے پامال کردیا مگر چونکہ حق بہر حال حق ہے اس کا پامال ہونا محال ہے۔ کیوں کہ **قد تبين الرشد من الغي** ۔ عالم آشکار لوگوں نے اپنی نجس آلودگیوں کو دنیا پر ظاہر کردیا کہ ایسے کھلم کھلا گندے ہیں جنہیں صحابی سمجھنا بھی گناہ ہے۔

ایسے لوگوں کے نام چھپا کر اگر پورے عالم سے دریافت

کیا جائے کیا ایسے لوگ جنہوں نے ایسے ایسے جرم کئے ہوں اور کھلم کھلا ایسا کیا ہو ان کو صحابی کہا جا سکتا ہے۔ کیا اس کو صحابیت رسول اکرمؐ کے شرف سے نوازا جا سکتا ہے تو عالم اسلام ایک زبان ہو کر پکار اٹھے گا نہیں ہرگز نہیں۔

پھر بھی نہ جانے کن سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے صحابیت حضور اکرمؐ کی عظمت کو حقیقی معیار سے گرا کر اتنا سستا بنا دیا کہ ہر کہ و مہ کو، ہر رستہ چلتے راہگیر کو صحابی رسول کہلائے جانے کا مستحق سمجھا جانے لگا۔

سب سے آخر میں یقیناً حق تلفی ہوگی اگر چمن زارِ سرکار استاذی العلام کی آبیاری کرنے والی ہستی کی ناقدر شناسی کا ارتکاب کروں یعنی حجۃ الاسلام مولانا میثم زیدی صاحب، ان کی عرق ریزیوں، ان کی جانفشانی کا اعتراف نہ کروں جو موصوف نے سرکارِ طاب ثراہ کے خزانے کو جمع کرنے میں زحمتیں برداشت فرمائی ہیں۔ اللہ ان کی ہمت میں اضافہ فرمائے۔ حق یہ ہے کہ احسانِ عظیم ہے قوم پر کہ ان مدفون خزانوں سے قوم کو مالا مال فرما دیا۔ اللہ سلامت رکھے۔ فقط

سید محمد شاکر نقوی

یکم، جمادی الثانیہ ۱۴۳۲ھ

۵/ مئی ۲۰۱۱ء

فہرست کتب مطبوعہ علامہ عدیل اخترؒ

۱ تسکین النفس فی صلح الحسنؑ

۲ تدلیس شبلی

۳ علمی خیانتیں

۴ صلۂ تاریخ احمدی

۵ مسئلۂ تقیہ (الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان)

۶ دعوۃ النظر الی خلافۃ خیر البشر

۷ فلسفۂ اسلام یا علم کلام

۸ رجال فکر و نظر (اصحاب الیمین ما اصحاب الیمین)

حیات بخش ذکر

فاضل نبیل عالم جلیل مولانا سید کاظم رضا واعظ

(یہ مضمون مولانا مرحوم نے والد علام کی فرمائش پر لکھا تھا لیکن اب تک تشنۂ طباعت رہا آج ہم اسے علامہ مرحوم کی اس کتاب کے ساتھ شامل کر کے نذر قارئین کر رہے ہیں میثم زیدی)

فیلسوف اسلام استاذ الواعظین علامہ سید عدیل اختر صاحب قبلہ مرحوم طاب ثراہ کا ذکر جمیل کسی بھی ظرف زمان میں خالی از فائدہ نہیں۔ آپ کے تابندہ نقوش حیات کی جھلک آج بھی آپ کے پالے پوسے پرورش پائے تلامذہ میں حسن عمل کی صورت میں نمایاں ہے جو تولید شکل کے فلسفہ پر مہر تصدیق لگاتی ہے۔ بہر حال باقی آثار ہی سے پچھلے آثار کی بہ آسانی شناخت دریافت ہوتی ہے۔ لاریب آپ کی پاکیزہ زندگی پر از علم و عمل لمحات سبق آموز ہدایت نشان ہیں نکھرا اور ستھرا کردار جسکی خوبی وخوشنمائی سادگی و پرکاری، جاذبیت و ندرت سے خالی نہیں۔ دنیا میں اطمینان و فراغت کا عرصہ نہ ملنے کے باوجود وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ جو شائد باید کوئی بخاطر پریشان انجام دے سکے۔ پچپن سالہ زندگی جس میں سے عہد طفلی اور تربیت و تعلیم کے عرصہ کو نکال کر خدمت و عمل کی مدت کم ہی رہ جاتی ہے۔ اس تھوڑے اور مختصر زمانے کو غنیمت جان کر تعلیم و تدریس، تحریر، تقریر، تفکیر و تحقیق، تبلیغ دینی، اخلاقی، سماجی، جیسے تعمیری تہذیبی امور کے انجام دینے میں اس طرح صرف فرمایا کہ

گردش ایام کے باوجود وقت کو اپنے رائیگاں جانے کا شکوہ نہ ہو سکا۔ ذکر سے پہلے بطور تعارف نام ونسب کا بیان کرنا ازبس ضروری ہے۔

۲۹ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ منگل کے دن آپ اپنے آبائی وطن علی نگر پالی، ضلع جہان آباد (گیا) بہار میں پیدا ہوئے۔ نام تاریخی عدیل اختر قرار پایا۔ ۲۶ واسطوں سے آپ کا سلسلہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ جیسی نادر شخصیت ویسے ہی آپ کا نام بھی نادر انوکھا رکھا گیا۔ خود آپ اپنے نام کے سلسلے میں فرماتے تھے کہ معصومین علیہم السلام اور اللہ کے اسمائے صفات سے کچھ بھی اپنے نام کا جز نہیں کہ جس کی بناء پر بے ادبی، بے احترامی کا اندیشہ لاحق ہو۔ یہ وہ نام ہے جس کو آزادی سے پکارا، لکھا، پڑھا، رکھا اٹھایا جا سکتا ہے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ، پٹنہ میں حاصل فرمائی۔ جس کے بعد مدرسہ ناظمیہ لکھنؤ میں ممتاز الافاضل تک عربی دینی تعلیم مکمل کی۔ اپنی خداداد ذہانت ولیاقت سے ہمیشہ اپنے درجہ میں ممتاز ہی کامیاب ہوتے رہے۔ آپ کے ساتھیوں میں مولانا حافظ کفایت حسین صاحب قبلہ، مولانا سید خورشید حسن صاحب قبلہ، مولانا سید محمد عمید صاحب قبلہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آپ تمام ساتھیوں میں کم عمر تھے۔ ۱۹۱۹ء میں جب مدرسۃ الواعظین وجود میں آیا تو آپ نے افتتاح کے ساتھ ہی بحیثیت طالب علم شرکت فرمائی۔ یہاں بھی خاص امتیاز حاصل رہا۔ ۱۹۱۹ء سے لیکر تادم واپسین مدرسۃ الواعظین سے وابستہ رہے۔ تعلیمی مدت بحسن وخوبی گذار کر جس وقت شعبۂ تبلیغ میں تشریف لائے تو آپ اور آپ کے چند ساتھی افق تبلیغ پر پہلے پہلے چمکنے والے ستارے تھے۔ جو ثابت رہ کر راہ و منزل کو قطع کرتے چلے۔ واعظ یا مبلغ مدرسۃ الواعظین جس کی صورت معاشرہ میں بن بلائے مہمان کی ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ جہاں گئے خود گئے۔ جہاں لڑے اپنی کوشش سے لڑے۔ خود کو پہنچوایا۔ "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" مجلس و نماز کے لئے خود خواہش کی۔ بقول استاذنا العلام طاب ثراہ بستی، کھیڑوں، قصبات،

دیہات میں پھر آواز لگانا ''ٹوٹے پھوٹے ایمان درست کرالو'' اس پر اخلاقی ناشناس کا سامنا واعظ کے لئے بڑے دل گردے کی بات ہے۔

راہ تبلیغ کی دشواریوں کا جھیلنا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔ وہی یہ کٹھن کو جھیل جاتا ہے جو دینداری کا خاص جذبہ و ولولہ رکھتا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم تبلیغ کے میدان میں ایک مرد آہن تھے۔ اللہ نے قوت برداشت کو دیکھتے ہوئے۔ گویا آپ کو اس کے لئے چنا تھا جو آخر دم تک نہیں تھکے جب کہ دوسرے ساتھی ایک ایک کر کے راستے سے کنارہ کش ہو گئے۔ مختلف انداز کا مقابلہ بھی بالکل بے رخی سے عوام مومنین کا بسبب ناواقفیت پیش آنا ''آگے بڑھو پھرا کرو'' جیسے ہمت شکن فقرات کو سن کر اپنے کام پر ڈٹے رہنا کوئی معمولی کام نہیں۔ یہ مولوی صاحب کی خداداد صلاحیت تھی جس نے پورے صبر وضبط سے کام لیکر دور دراز مومنین کی اجنبی بستیوں میں جا کر اجنبی ناشناس ماحول میں محض ایمانی، دینی، برادری کے ناطے حسن کردار و گفتار سے راہ رسم پیدا کرنا ان میں خود کو قابل قبول بنانا لوہے کے پگھلانے اور پتھر کے موم بنانے کے عمل سے کم بات نہیں۔

تبلیغ کی راہ کی اڑچنیں

اجنبی حضرات مومنین میں متعارف ہونا اور پہلی ملاقات کا خیریت سے گذرنا ہی خاص کامیابی نہیں ہے بلکہ جتنے درمیان واعظ موجود ہے ان کی گفتگو ان کی زبان سے واقفیت ازبس لازم ہے۔ اس لئے کہ ''زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم'' کی صورت میں ناکام نامراد رہنا ہوگا بسلسلہ تبلیغ واعظ کو دور سے دور مقامات پر جانے کی ضرورت ہوتی ہے اندرون ملک بیرون ملک کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ خود عظیم ہندوستان کے صوبوں میں مختلف زبانیں مقامی طور پر بولی جاتی ہیں۔ اگر واعظ ان زبانوں سے قطعاً ناواقف ہے تو مومنین اس کے ارشاد و ہدایت سے محروم رہیں گے۔ ترجمان سے کام نہیں بنتا۔ پھر واعظ غریب کو یہ کہاں نصیب نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مبلغ و

واعظ کو ہر جگہ کی زبان سیکھنا پڑتی ہے تا کہ اپنے ماضی الضمیر سے دوسروں کو آگاہ کر سکے۔ مولوی صاحب کامیاب تبلیغ کے اس گر سے واقف تھے۔ جبھی آپ ہفت زبان سے یاد کئے گئے۔ جیسے جس زبان سے واقف ہونے کی ضرورت پڑی اس کو حسب ضرورت آپ نے سیکھا لکھا پڑھا۔ یوں آپ کا رابطہ براہ راست مختلف زبان والے مومنین سے ہو گیا اور تبلیغ کی کاوش و کوشش نتیجہ کے طور پر سہل و آسان ہوگئی۔ آپ نے تبلیغی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اولاً صوبہ بہار و بنگال کو اپنا مرکز بنایا۔ بنگال میں رہ کر بنگلہ زبان حاصل فرمائی۔ برا عظم افریقہ میں تبلیغی مہم پر تشریف لے گئے۔ زنجبار مڈغاسکر کے دورہ میں سواحلی زبان بولنے کی مہارت پیدا کی ہندوستان میں صوبہ سرحد میں رہ کر پشتو زبان سیکھی اور پنجاب میں پنجابی زبان آسانی سے بولنا سیکھا۔ آپ بیک وقت پشتو پنجابی بنگلہ سواحلی، گجراتی، عربی، فارسی، انگریزی سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ لکھنے پڑھنے کی طاقت رکھتے تھے اور ضرورت پر مذکورہ زبانوں میں کلام فرماتے تھے۔

کامیاب تبلیغ

بلاشبہ حضرات واعظین بھی منجانب مدرسۃ الواعظین لکھنؤ جابجا تبلیغی مہم پر تشریف لے گئے اور قابل قدر خدمات انجام دیئے لیکن مولوی صاحب مرحوم اور دیگر واعظین میں یہ امتیازی فرق نمایاں طور سے پایا جاتا ہے کہ دوسرے مبلغ و واعظ حضرات ایک دو جگہوں پر جا کر کسی ایک جگہ کے ساتھ وابستہ ہو گئے اور جم کر بیٹھ گئے۔ بنگال میں بھیجے گئے تو بنگال کو اپنا مستقل مرکز قیام بنالیا۔ پنجاب میں جانے کے بعد پنجاب ہی کو دوسرا اپنا وطن بنالیا اور مدرسۃ الواعظین لکھنؤ سے رابطہ کو منقطع کر لیا لیکن مولوی صاحب قبلہ مرحوم نے ہمیشہ تبلیغی ضرورت کو اپنی آسائش خاطر پر مقدم فرمایا ورنہ مڈغاسکر افریقہ اور پشاور صوبہ سرحد ہندوستان میں تمام تر آسائش اور آرام فراہم تھا یہاں تک کہ ان مقامات پر جو اثرات علیحدگی پر چھوڑے اس سے دوسرے حضرات

واعظین مشتعل ہوئے اور چلے آنے کے باوجود مومنین نے اپنا ربط مولوی صاحب مرحوم سے آخر دم تک باقی رکھا۔ مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ پشاور کے حضرات مومنین اپنے قضایا میں اکثر آپ سے رجوع فرماتے تھے۔

مدرسۃ الواعظین سے جہاں بھی کہیں تبلیغی ضرورت سے آپ کو بھیجا گیا بغیر عذر تشریف لے گئے اور کامیاب و کامران وہاں سے واپس ہوئے آپ کے تبلیغی کارنامے قابل ذکر ہیں گنجائش نہیں کہ انھیں ایک ایک کر کے گنوایا جائے۔ پشاور کی تقرری کے زمانہ میں مدرسۃ الواعظین کی جانب سے آپ کو تبت کی تبلیغی مہم پر بھیجا گیا جہاں پہنچ کر آپ کو نور بخشیہ فرقہ کے لوگوں میں رہ کر تبلیغ کرنا پڑی۔ چنانچہ یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ آپ نے وہاں رہ کر جماعت ۔۔۔۔ کے غلط اصول و عقائد کو شکست فاش دی اور برحق دین اسلام کے اصول و عقاید ان پر واضح کئے۔ افریقہ میں اسماعیلیوں کا سامنا ہوا ان کو اثنا عشری طریقہ سے قریب تر لانے کی کوشش کی نتیجہ میں قبول حق کچھ نے کیا۔ پہلے در پردہ پھر کھلم کھلا اثنا عشری طریقہ پر چلنے لگے۔ سرحد کے قبائلی مسلمانوں میں کافی اصلاح کی ضرورت تھی۔ صحیح طور پر اپنے فرائض مذہبی سے ناواقف تھے۔ آپ نے ہر طرح انھیں مہذب بنایا اور ان میں دینداری پیدا کی۔

ضرورت تبلیغ

آپ کی کامیاب تبلیغ کا یہ اثر تھا کہ مدرسۃ الواعظین سے جہاں کہیں خاص ضرورت تبلیغ کی محسوس ہوئی آپ کو بھیج دیا سنگلاخ بیز علاقوں میں جانے سے ایک ذرا تامل نہ فرمایا۔ تبت، لداخ، اسکردو، سرحد، کلکتہ، رنگون، مدغاسکر زنجبار کاٹھیاوار، پنجاب، بنگال وغیرہ وغیرہ میں نہ صرف تشریف لے گئے بلکہ جس جگہ پہونچے اس طرح خدمات تبلیغ انجام دیے کہ مومنین میں نئی دینی جاگ پیدا ہوگئی۔ جہالت کے پردے دور ہوئے انداز تبلیغ صاف ستھرا، علمی، اخلاقی، قابل قبول جس کو بھی پسند

کرلیں۔ شیعہ برادری میں خود تبلیغ کی ضرورت دوسروں کو اسلام کی دعوت دینے سے بڑھ کر ہے اس لئے کہ دنیا میں رہ کر دین کے قدموں سے نہیں۔ دنیا کے پیروں سے چلنے لگے ہیں۔ مومن و مسلمان ہیں مگر عمل اس کے برخلاف ہے تعلیمات مذہب سے اتنا دور ہو چکے ہیں کہ عقائد و اصول دین تک معلوم نہیں۔ احکام و فروع دین سے واقفیت تو بڑی چیز ہے اور عمل اس سے بھی بڑھ کر بعید امر ہے۔ مولوی صاحب مرحوم کے مکالمات گرچہ دوسرے مذاہب کے علماء سے برابر رہے یہاں تک کہ واعظین میں تعلیمی ذمہ داری قبول کرنے پر بھی اکثر آریہ، عیسائی، قادیانی، بہائی مذہب کے مشنریز ورہنما تبادلہ خیالات کے لئے آتے رہے ہیں اور ایک ہی دو مرتبہ کی گفتگو کے بعد لاجواب ہو کر خاموش بیٹھ گئے۔ تبلیغی دورہ میں بحث و مباحثہ کے بعد بہت کچھ لوگوں نے آپ کے سامنے قبول اسلام کیا جارج سالون جنکا قبول اسلام کے بعد محمد جعفر نام تجویز ہوا آپ کے تبلیغی جد وجہد کا ایک ثمرہ ہے اس کے علاوہ اور کتنے اپنے آبائی مسلک سے تائب ہو کر مشرف با اسلام ہوئے۔

پھر بھی مولوی صاحب کی زمانہ تبلیغ میں خاص توجہ مومنین کی دینی اخلاقی، عملی و فکری بڑھاوے کی طرف رہی ہے۔ آپ جہاں بھی کسی مومن بستی میں تشریف لے گئے دو ایک دن گذرتے ہی بستی کے لوگوں میں ایک انقلاب فکری علمی دینی پیدا ہوا اور ان کی دینداری میں تیری طور پر اضافہ ہونے لگا اور امور مذہبی سے دلچسپی کا اظہار ہونا شروع ہو گیا۔ آپ کا بسلسلہ تبلیغ یہ فرمانا تھا کہ کوشش اس امر کی کہ غیر حلقہ بگوش اسلام ہوں اہم نہیں اہم تبلیغ اپنوں کی ہے کہ مومن مومن باقی رہے ایمان رخصت نہ ہو۔ مولوی صاحب مرحوم کا یہ فرمودہ حالات کے مشاہدہ سے اس وقت سے اب تک درست چلا آرہا ہے۔ دینداری کا مومنین میں فقدان اور دنیا کا رجحان اپنوں میں زیادہ سے زیادہ تبلیغ دین کی ضرورت پر زور دیتی ہے۔ دیکھا جائے تو اس وقت ہر چند تعداد شیعان حیدر کرار و موالیان اہلبیت علیہم السلام کی ماشاءاللہ بہت ہے مگر دینی پابندی اور

فرائض کی ادائیگی نیز دین سے آگاہی اور خود حفاظتی افسوس ناک حد تک کم ہے۔ دنیا کے لبھاؤ میں پڑ کر شعور سویا اور احساس مردہ ہو چکا ہے ایسے میں دوسروں کو دعوت حق دینے کے بجائے خود کے سنبھلنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے اور اس وقت تحریک دینداری میں حصہ لینے کی عام ضرورت ہے کہ اہل ایمان کا شیرازہ تباہ و برباد نہ ہو جائے ایمان جیسے گیا ہے۔ اگر حفاظت نہ ہو سکی تو رخصت بھی ہو سکتا ہے۔ دین اسلام دین عمل ہے۔ عمل ہی زندہ و باقی رہے گا۔ مولوی صاحب مرحوم کی دور رس نگاہ خوب پرکھتی تھی اسی لئے وہ تبلیغ کو اپنے درمیان سب سے ضروری جانتے تھے جس کے ذریعے اگر خالص دینی معاشرہ وجود میں آجائے تو باعمل مسلمان اور سچی اسلامی روش خود دوسروں کے لئے حق سے وابستہ ہونے کے لئے بڑی دعوت ہے۔

تعلیمی سربراہی

سنہ ۱۹۱۹ء میں جس وقت مدرسۃ الواعظین کا قیام عمل میں آیا تو خطیب اعظم مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ پہلے پرنسپل قرار پائے اور مولانا سید ابوالحسن صاحب عرف منن صاحب قبلہ مرحوم نائب پرنسپل مقرر ہوئے۔ مولانا سید سبط حسن صاحب قبلہ کے انتقال فرمانے پر مولانا سید ابوالحسن صاحب قبلہ مرحوم پرنسپل ہو گئے۔ اس کے برخلاف ضرورت نائب پرنسپل کے تقرری کی ہوئی۔ اس زمانہ میں مولوی صاحب مرحوم پشاور سرحد میں قاضی شریعت تھے چنانچہ آپ کا تقرر بحیثیت وائس پرنسپل سنہ ۱۹۳۹ء میں ہو گیا۔ اہل پشاور کسی طرح آپ کے چھوڑنے کو تیار نہ تھے لیکن حضرت نجم العلماء کے حکم سے مجبور ہو کر با دل ناخواستہ آپ کو لکھنؤ کے لئے رخصت کیا ایک ہی سال کا عرصہ گذرا تھا کہ پرنسپل صاحب نے انتقال فرمایا۔ قاعدے سے پرنسپل کے عہدہ پر بغیر قیل و قال مولوی صاحب کو ہو جانا چاہئے تھا لیکن مقامی علماء سے بھاری شخصیتیں اس منصب کی امید وار بن کر سامنے کھڑی ہو گئیں۔ مولوی

صاحب کے یہاں ذاتی صلاحیت اور تبلیغی، تعلیمی کارکردگی کے زور کے علاوہ کوئی اور اثر مقابلے میں نہ تھا لیکن بعد رد و قدح ارباب حل و عقد نے آپ کے بے لوث خدمات تبلیغ کو سراہتے ہوئے آپ ہی کو پرنسپل کے عہدہ پر مقرر کر دیا چنانچہ انتخاب کا اعلان ہوتے ہی قومی اداروں خصوصاً پراونشل کانفرنس صوبہ سرحد انجمن امامیہ نگشن استرزئی صوبہ کوہاٹ نے اس تقرر پر مدرسۃ الواعظین کو تحسین و تبریک کے بیانات بھیجے۔ سنہ ۱۹۳ء سے تا انتقال تعلیم و تربیت حضرات واعظین میں مصروف رہے اور تن تنہا پرنسپل کے فرائض انجام دیتے رہے۔ کس طرح لکھنؤ میں مع عیال کرایہ کے ایک مکان میں آپ نے نہایت قلیل تنخواہ میں گذر بسر کی دوسرا اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ جبکہ دوسری جنگ عظیم کے اثر سے سال بسال گرانی میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ سو سوا سو روپیہ تنخواہ میں کس طرح ضروریات پورے ہوتے تھے جبکہ اعلیٰ منصب کے لحاظ سے قہری اخراجات کی مد بھی لگی رہی۔ بہر حال یہ معلوم ہے کہ ہر مہینہ قرض کا بڑا بوجھ ہو جاتا تھا جس کو کسی نہ کسی صورت سے ادا فرماتے تھے۔ چہرہ سے کبھی فکر مندی، پریشانی کا اظہار نہیں ہوا خوش پوشاکی میں فرق نہ آیا۔ ماشاء اللہ جامہ زیب تھے اچکن یا شیروانی سنجافی کوٹ کا بڑے پائنچے کا پاجامہ عمدہ دوپلی سر پر ٹوپی، گھڑی، چھڑی، عینک ہر طرح سے درست ہو کر گھر سے برآمد ہوتے تھے مولوی صاحب رسم شکن بھی تھے چنانچہ شیروانی پر عمامہ اور دستی گھڑی خلاف رسم استعمال فرمائی۔

کار و منصب

آج عموماً پرنسپل کا مطلب مدیر ہے کالج اسکول کا منتظم و نگران جس کا کام نظم و ضبط ادارہ ہوتا ہے۔ درس و تدریس سے اس کو بری سمجھا جاتا ہے وہ تعلیم کا بندوبست کرتا اور اس کا نگران ہوتا ہے مولوی صاحب جس وقت پرنسپل ہوئے تو نائب پرنسپل کی مد تخفیف میں آگئی۔ یوں پوری تدریس کی ذمہ داری آپ کے سر رہی۔ آپ

نے جس حسن وخوبی سے اس ذمہ داری کو نبھایا ہے۔ شاید ہی کوئی دوسرا اس طرح اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہوتا۔ وقت مدرسہ سے کم ازکم آدھ گھنٹے پہلے واعظین میں تشریف لانا اور وقت ہوتے ہی اپنی کرسی پر فروکش ہوجانا۔ طلاب کا اپنے کمروں سے دوڑ کر درسگاہ میں پہونچنا پھر نہایت خاموشی سے جماعت وار تفسیر رجال ودرایت دیگر کتب درسی کا درس پھر تقریری مقابلے باہم مکالمات مختلف موضوعات پر تیاری اور مسائل معترض ومجیب میں بٹ کر طلاب کا کسی موضوع پر سیر حاصل بحث کر کے تیار ہونا اور وہ مولوی صاحب کا ایک ایک مقرر کے لب ولہجہ انداز بیان مبیز ومواد ہاتھ پیر کے حرکات وسکنات زبان درست الفاظ مطالب سب پر گہری نظر رکھنا دوسرے طلاب کو اجازت دینا کہ وہ محسوس غلطی پر ٹوک کر مقرر کو متوجہ کریں بعد روداد ان کے آخر میں طریق صواب وسواد سے آگاہ کرنا اور موضوع کو متعین فرما کر کاپیوں پر لکھوانا اور ہدایت کرنا کہ کتابوں کو دیکھ کر موضوع سے متعلق چیزیں تحریر فرمائیں جب کوئی طلاب میں سے پوچھتا کہ کون کون سی کتابیں موضوع کی تیاری کے لئے دیکھیں تو سستی و فکر کو مہمیز کرنے اور صلاحیت کو بروئے کار لانے کے لئے یہی فرماتے تھے کہ ماشاء اللہ آپ سب افاضل ہیں۔ یہ کنجیاں ہیں اور یہ فن وار کتابوں کی الماریاں اٹھئے اور تلاش کیجئے کہ اس موضوع کا تعلق کس علم وفن سے ہے اور اس کے لئے کیا کیا دیکھنا چاہئے یعنی بات جس علم وفن کی ہو اس سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کریں۔ ہمیشہ کوشش فرماتے کہ طلاب میں خود اپنی نظر پیدا ہو اور اپنا کام آپ کریں۔ پکی پکائی کھچڑی کھانے پر نہیں لگایا۔ انگریزی جس سے اکثر عربی طلاب نابلد ہوتے ہیں اگر کوئی بات ایسی کتاب سے نقل کرنا ہوتی جیسے انسائکلو پیڈیا آف برٹانیہ سے تو خود کتاب نکال کر دیکھ کر ترجمہ فرما کر حوالہ نقل فرما دیا کرتے تھے۔ حالت تقریر میں ناظر رہتے تھے کہ دوران تقریر کوئی عبث کام تو نہیں انجام دیا ہے جو مضحکہ خیز ہو۔ کھڑے ہونے کی حالت میں سہارا لینا میز کرسی پر ہاتھ ٹیک کر بیان کرنا ایسی کسی بھی عادت پر روکتے ٹوکتے تھے۔ مناظرہ کے

سلسلہ میں خاص ہدایت فرماتے تھے۔ شخص مقابل سے خوب ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے جو موضوع سے ہٹ کر دوسری باتوں میں الجھانے یا طیش دلانے والی باتوں سے ذہنی توازن بگاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے کبھی خارج از موضوع باتوں میں الجھنے کی ضرورت نہیں بلکہ فہمائش کر کے مقابل کو زیر بحث موضوع کا پابند بنائیں۔ یہی اس کی ناکامی کا آخر سبب ہوگا۔

درس کے تمام ہونے کے بعد لکھنے پڑھنے مطالعہ کرنے کی زیادہ سے زیادہ تاکید فرماتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ سڑک پر پڑے ایک کاغذ کے لکھے ٹکڑے کو بھی فضول نہ سمجھو اٹھا کر پڑھو اس میں بھی کوئی بات مل سکتی ہے۔ نیز مکرر فرماتے تھے یہ تین سال غنیمت جانئے پھر یہ فراغت یہاں سے نکلنے کے بعد نصیب نہ ہوگی تا ہم کتنا بھی نہ آپ کے لئے فراہم ہے جتنا چاہئے پڑھئے لکھئے جو ذخیرہ کرلیں گے وہی کام آئے گا۔

آپ نے نصاب تعلیم جدید طور پر تبلیغی تجربات کی روشنی میں جو مرتب فرمایا وہ بغیر کسی تغیر وتبدیلی کے اب تک چل رہا ہے گرچہ اس طرف داخلہ کے معیار گھٹنے اور علمی سطح کے کم ہونے سے ایک دو کتابیں نصاب سے علیحدہ ہوگئی ہیں۔ نصاب میں دو طرح کی کتابیں ہیں ایک وہ جس کا درس ہوتا ہے۔ دوسرے وہ لازمی مطالعہ کی کتابیں جو نصاب میں شامل ہیں۔ نصاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے سوچ بچار سے کام لے کر کتابوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

ممتحنین کا انتخاب

اپنے طور پر مولوی صاحب کسی ممتحن صاحب کو منتخب فرماتے تھے اور یہ بات صیغہ راز میں رہتی تھی سوائے خود یا مہتمم کمیٹی نہ مولانا سید سمیع الحسن صاحب کے کوئی تیسرا شریک کار نہ تھا کم از کم کامیابی کے لئے ۴۰ فیصدی نمبر درکار تھے۔ میرے عہد تعلیم میں مولانا سید خورشید حسن صاحب قبلہ مرحوم، مولانا سید محمد عمید صاحب قبلہ زنگی

پوری، مولانا سید محمد عبادت صاحب قبلہ امروہہ مولانا شاہ عبدالحسین صاحب قبلہ مرحوم و مولانا سید ابن حسن صاحب نونہروی آتے۔ مذکورہ حضرات تقریری امتحان لینے کے لئے خود مدرسۃ الواعظین تشریف لاتے تھے اور جو وقت کسی موضوع پر امتحان تقریری ہوتا تھا مولوی صاحب وقت پر اس جگہ سے ہٹ جاتے تھے امتحان کے وقت تک دوسرے انتظام میں مشغول رہتے تھے۔

کیسے اعتدال مزاج پیدا ہو آخر کوشش میں کامیابی ہوئی، کامیابی وقتی ہوتی اگر صرف کہنے سننے، نصیحت و فضیحت کو قانون کے نفوذ تک رہنے دیا جاتا لیکن یہ کردار سازی خود حسن کردار اور تعلیم اخلاق اپنے حسن خلق کی بنیاد پر تھی۔ طبیعت کا طبیعت پر اثر ڈالنا یوں دوسرے کا متاثر ہونا پائیداری نہیں بلکہ ہمیشہ کی کامیابی ہے بات تحفۂ مثال رہ جائے گی اس لئے بجائے دوسرے کے اپنی مثال پیش کرتا ہوں ۱۹۴۶ء میں واعظین میں داخلہ کے لئے انتخاب ہوا کامیاب ہونے پر داخلہ منظور ہوا پہلے ہی دن مولوی صاحب مرحوم نے میری وضع قطع ہیئت کذائی دیکھ کر فرمایا مولوی کاظم رضا صاحب یہ مدرسۃ الواعظین ہے یہاں یہ علیگڈھی گھونسا اور یہ کشتی نما ٹوپی نہیں چلے گی" بات گراں گذرنے والی تھی مگر ٹھنڈے دل سے سنا اور خوشدلی سے ٹوپی بدل دی پائنچے والا پاجامہ بنوا کر پہننا شروع کر دیا۔ یہ انقلاب طبیعت یہ اہل وضع مولوی صاحب کی روحانیت کے اثر سے تھا "ہر چہ از دل خیزد بر دل ریزد" مولوی صاحب مرحوم ہم جیسے بے گڑھے افاضل سلطانیہ، ناظمیہ، جوادیہ کو مولوی صاحب مرحوم نام سمیت پکارتے خطاب فرماتے تھے مولوی اختر صاحب مولوی معصوم صاحب مولوی سجاد صاحب بطور خود لمبائش تھی کہ نہیں ہو تو اب سے مولوی بنو اپنی اصلاح کرو اپنے اخلاق سنوارو وضعداری میں اضافہ ہو پڑھو کڑھو بنو۔

سر کے بال شیروانی، قمیص کے بٹن

بڑے بالوں کی وبا اب تو عام ہے پہلے سے مدارس دینی میں بڑے بال الاؤ نہ تھے ذرا کسی کے بال بڑے ہوئے فوراً حجام کو بلا کر موزون ہو گیا واعظین کے حدود میں بڑے بال داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے مولوی صاحب مونڈنے کے نہیں بال مشین سے کم کرنے کے قائل تھے مرحوم اپنے مولوی صاحب یعنی حضرت نجم العلماء کے ایک مسودہ کو یہاں نقل فرماتے تھے کہ "ہو سکتا تو تم سب کے سر کے بال ہر دو دن بعد مونڈوا دیتے خوب بڑی بڑی کھوپڑیاں ہوتیں جس طرف سے گذرتے دیکھکر لوگ ہنستے تمہاری کسی طرح شرم تو دور ہوتی" اب آج کل مدارس و جامعات مدرسۃ الواعظین بھی جگہ طلاب سے اساتذہ تک ٹوپی کی جگہ بالوں کا استعمال کیا جا رہا ہے۔

شیروانی قمیص کے بٹن کھلے رہیں یہ بھی ایک ادائے دیوانہ ہے۔ یہ دیوانگی کا حسن مولوی صاحب کو کبھی نہیں بھایا ذرا کسی کے شیروانی قمیص کے بٹن کھلے نظر آئے تو فوراً قریب بلایا اور اپنے ہاتھ سے بٹن ایک ایک لگا دیئے بٹن لگاتے ہوئے فرماتے کہ درزی نے کاج فضول نہیں بنائے ہیں بٹن بند کرنے کے لئے بنائے ہیں دیکھنے میں یہ باتیں معمولی ہیں مگر یہی مریض نفس کا تیر بہدف علاج ہے کہیں تکبر چکنا چور ہوا کہیں خودنمائی کا دیوالہ نکلا۔ کہیں احساس کمتری کا جنازہ نکل گیا۔ ساتھ ہی شرعی فائدہ کہ یہ اصلاح نماز میں آج کام آ رہی ہے خود اعتمادی کے فقدان سے بہت سے اتفاق کام خلاف شان محسوس ہونے لگتے ہیں خطرہ لگا رہتا ہے کہ اگر یہ کام انجام دیا تو شان گھٹ جائے گی مثلاً بازار سے ضرورت کی شے گھر بھجوانا ہے یا گھر سے ہاتھوں میں لیکر کوئی شئی نکلنا ہے تو بہت ڈرتے ڈرتے ہزار پردوں میں چھپا کر ادھر ادھر دیکھتے کوئی دیکھ نہ لے کوئی پوچھ لے جیسے میلے کپڑے واشنگ میں دینا ہیں یا جوتے کی مرمت کرانا ہے تو کاغذ یا کپڑے کی تلاش ہوگی کہ اس میں چھپا کر لے جائیں دوسرے یوں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے حالانکہ دوسروں کا محض دغدغہ ہے آپ اپنے ہی کو عیب لگا رہے

ہیں جبکہ اپنے کام میں نہ کوئی شرم ہے نہ عیب۔ مولوی صاحب خود اپنے کام انجام دیتے تھے دھوپ میں بیٹھنا ہوا وجہ سے کرسیاں لگا نا ہے ملازم نہیں ہے۔ خود کرسی میں ہاتھ لگایا بڑھ کر طلباء نے مولوی صاحب کی کرسی اٹھا کر دھوپ میں لا کر رکھی ساتھ ہی میں سب اپنی اپنی کرسی بھی باہر اٹھا لائے جبکہ اس سے قبل ہاتھ باندھے سب ملازم کا انتظار کر رہے تھے اپنے عمل سے انا کا کیڑا مردیا جو رخنہ اندازی کر رہا تھا۔

مولوی صاحب جب بھی عربی کے کسی طالب علم کو انگریزی وضع قطع میں دیکھتے تو اس سے بطور سوال پوچھتے آپ اگر ''ڈاکٹر انجینئر وکیل بننے کے لئے پڑھ رہے ہیں تو یہاں سے نہ ڈاکٹر بن کر نکلیں گے۔ نہ انجینئر اس کے لئے دوسری جگہ ہے اور اگر یہی کچھ پڑھنا ہے تو پھر مولوی بنو، نہ دھوکا دو نہ دھوکا کھاؤ۔

تعلیم گاہ کی تہذیب

تعلیم گاہ اور کتبخانہ دونوں مولوی صاحب کے تحت نظر تھے لیکن کتبخانہ کے پہلے حصہ ہی میں مع طلباء بیٹھتے تھے تا کہ کتابوں کے نکالنے رکھنے میں نگران ومحافظ کو زیادہ زحمت نہ ہو نیز خود طلباء کو بھی آسانی ہو۔ اوقات تعلیم غیر وقت تعلیم کسی بھی وقت کتبخانہ یا تعلیم گاہ میں بیڑی سگریٹ حقہ پینا ممنوع تھا۔ چنانچہ عادی حضرات باہر نکل کر اپنی طلب پوری کرتے پھر واپس اپنی جگہ پر ہوتے تھے لطیفہ اس پابندی کے سلسلے میں یہ گذرا کہ مرحوم مغفور جناب راجہ امیر احمد خانصاحب محمود آباد مدرسہ تشریف لائے اور مولوی صاحب سے ملنے کتبخانہ میں آگئے حسب عادت سگریٹ جلائی مولوی صاحب نے پاس خاطر کچھ نہ فرمایا لیکن دوسرے لوگوں کے کنا یا اشاروں سے راجہ صاحب تاڑ گئے فوراً مولوی صاحب سے اجازت چاہی مولوی صاحب نے فرمایا کہ آپ تو مالک مختار ہیں آپ پر کون قانون لگا سکتا ہے یہ سنتے ہی فوراً سگریٹ بجھادی اور معافی چاہی کوئی کتبخانہ میں بلند آواز سے بول نہیں سکتا تھا اگر کوئی مطالعہ کے لئے

آتا اس کو مطلوبہ کتابیں محافظ نے کر دیں اب اگر اس کو کچھ پوچھنے کی ضرورت ہوئی تو خود بتلایا اور اگر کتابوں کی مدد کی ضرورت ہوئی تو کسی طالب علم کو بدد کرا کے حوالہ کام کر دیا آخر میں کام انجام پانے نہ پانے کو پوچھتے تھے، ڈاکٹریٹ کرنے والے اپنے تھیس لکھنے کے لئے واعظین آتے تھے اسلئے اور کہ مولوی صاحب سے کافی مدد حاصل ہوگی اچھا خاصا مواد و میٹرل جائے گا۔

تربیت یافتہ مبلغین

یوں تو ایک بڑی تعداد حضرات مبلغین کی ہے جو ۱۹۳۶ء تا ۱۹۵۱ء مولوی صاحب مرحوم کے عہد کرامت مہد میں مدرسۃ الواعظین سے سہ سالہ تعلیمی زمانہ گذار کر نکلے اور دو سالہ مدت تبلیغ گذار کر کہیں نہ کہیں کسی جگہ بھی آسائش کے خیال سے رک گئے اور پیش نماز یا خطیب کی زندگی گذارنے لگے یا مدرسۃ الواعظین سے رشتہ تبلیغ برقرار رکھتے ہوئے کارہائے تبلیغ میں منہمک رہے جو بھی صورت رہی ہو مولوی صاحب کے روحانی صفات کا کم وبیش اظہار ضرور آپ کی پالی پوسی اس روحانی اولاد سے ہوتا رہا یہاں پر اس واقعیت کا اظہار بیجا ستائش میں شمار نہ ہوگا کہ بحیثیت استاد مولوی صاحب کی ہستی بعض اعتبارات سے اساتذہ میں سب سے الگ تھلگ تھی پہلی بات تو یہ دوسرے اساتذہ کا مشترک انداز یہ رہا کہ وہ ڈیوٹی کے طور پر وقت معین پر مدرسہ تشریف لائے درجہ میں منتظر طلباء سے ملاقات کی کتابوں کا درس دیا حاضری کا رجسٹر مکمل کیا مدرسہ کا وقت ختم ہوا فقط طلباء اپنے اقامت گاہ پر واپس ہوگئے اور استاذ محترم اپنے مکان تشریف لے گئے سوائے پڑھنے پڑھانے کے استاذ و شاگرد میں اور کسی قسم کا ربط پیدا نہیں ہوا۔ ہر ایک نے اپنی قانونی ڈیوٹی پوری کی۔ ویسے ہی جیسے دنیاوی علوم کے کالج اسکول کا حال ہے کہ استاد کالج کے صرف ملازم ہیں اور طلاب اسکول جا کر اپنی فیس حلال کرتے ہیں کالج سے باہر نہ سر پرست ہیں نہ طلاب روحانی اولاد

یہ انداز چاہے درست نہ ہو مگر دنیا کی خودغرضی سے بعید نہیں مگر یہ حال دینی درسگاہوں اور روحانی مکاتب و مدارس میں معلمین و رہنمایان دین سے افسوسناک ہے جن کی ذمہ داری صرف کتابوں کی حد تک نہیں بلکہ پرورش دینی و روحی اصلاح باطن و تہذیب نفس ہے اور اخلاق سنوارنا بگڑے عادات کا درست کرنا پند دین بتاتا ہے۔ مولوی صاحب مرحوم کو تین سال کی مدت میں تربیت دے کر واعظ و مبلغ بنا کر دنیا خصوصاً اپنی قوم کے سامنے پیش کرنا تھا۔ بالفاظ دیگر ایک نمونہ عمل (آئیڈیل) اس لئے پڑھانے سے صرف واسطہ نہ رکھا بلکہ ہر بننے والے واعظ اور نکلنے والے واعظ کے ظاہر و باطن پر گہری نظر ڈالی اس کے نفسیات کی جانچ پرتال کی۔ کس میں کس چیز کی کمی کس میں کس چیز کی زیادتی ہے اور کسر وانکسار ہے۔

جنس غیر مفید کا اخراج

طلاب سے بے حد محبت کے باوجود اخلاقی کمزوری عادی کوتاہی ناقابل برداشت تھی یہ واقعہ ہے کہ امتحان سالانہ کے پہلے دن جبکہ طلاب پرچہ لکھنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں ایک فاضل کو اسی موقع پر مولوی صاحب کا بسعد اخراج حکمنامہ ملتا ہے کہ آپ ہرچند علمی صلاحیت رکھتے ہیں مگر میں افسوس کے ساتھ مدرسۃ الواعظین سے خارج کرتا ہوں۔ اس لئے کہ آپ اپنے اخلاق عادات کہنہ کی بنا پر کسی طرح واعظین کے واسطے مفید نہیں ہیں مجھے یاد ہے کہ وہ بغیر کچھ کہے سنے اٹھ کر مولوی صاحب کو سلام کر کے امتحان گاہ سے رخصت ہو گئے اور پھر مدرسۃ الواعظین کو چھوڑ دیا۔ فاضل مذکور نے خاموشی اختیار کر کے تسلیم کیا کہ مولوی صاحب کا اقدام بالکل بجا ہے۔ ہم نے فہمائش کا اثر نہیں لیا اس کا آخر یہ نتیجہ نکلا۔

اوپر کی بیان کی ہوئی باتوں سے قارئین اس امر کا اندازہ بآسانی کر سکتے ہیں کہ مولوی صاحب دوسرے اساتذہ سے کن چیزوں میں ممتاز تھے تقابل مقصود نہیں نہ

ایک شاگرد کا یہ منصب ہے۔ میری نظر میں میرے کل اساتذہ ہر طرح معظم و مکرم و محترم ہیں۔ الحمدللہ دعا میں ہر روز یاد کرتا ہوں اب تو سبھی خلد آشیان ہو چکے ہیں ایک ہستی صرف زندہ و باقی ہے خدا ان کے سایہ کو برقرار رکھے وہی حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید محمد حسین قبلہ دام ظلہ (زینبیہ کربلائے معلی) ہیں پھر بھی مولوی صاحب و دیگر اساتذہ کے لئے یہ عرض کر سکتا ہوں کہ اتنا وقت کسب فیض کا جو مولوی صاحب مرحوم کے ساتھ گذرا اور کسی استاد کے ساتھ نہیں گذرا۔ ایک ایک سال کا عرصہ وہ بھی درجہ کا تعلق ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی ہے کہ باوا اگر آپ برابر جوان نوجوان ہے تو باپ کو اس سے مشورہ کرنا چاہئے اس سے رازداری کی باتیں گاہ بگاہ کرے تا کہ اولاد کو محسوس ہو کہ باپ کو ہم پر اعتماد ہے۔ ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ بیوقوفی دوسروں سے رائے مشورہ نوجوان بیٹے سے بات بھی نہ پوچھنا یقیناً دکھ کی بات ہے۔ دریں صورت اولاد بخوف بزرگی و احساس کمتری دور ہی دور رہنے میں عافیت جانتی ہے۔ مولوی صاحب مرحوم اپنی روحانی اولاد کو اپنے برابر جانتے اور وہی برتاؤ فرماتے تھے درجہ میں استاذ بزرگ کی صورت رہی۔ رعب ایسا کہ سب دم بخود اگر کسی کو کچھ کتاب میں پوچھنا ہوا تو ایک دوسرے ساتھی کو آمادہ کرتا کہ وہ جا کر مولوی صاحب سے مشکل حل کرے ادھر ادھر کی زائد بات کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا وہی مولوی صاحب درجہ کے علاوہ ہم طلاب کے درمیان بہترین جلیس تھے۔ یہ معمول رہا کہ اوقات تعطیل میں اگر گھر سے برآمد ہوتے تو سوائے مدرسہ اور کہیں کسی جگہ تشریف نہیں لے جاتے تھے مدرسہ میں تشریف لانے کا مقصد طلاب کے درمیان کچھ وقت گذارنا تھا اور بس۔

تحریک عمل

جب آن پڑتی ہے تو سب کرنا ہی پڑتا ہے انسان پہلے نادانی کا عذر تراشتا ہے کام سے پیچھا چھڑاتا ہے مدرسۃ الواعظین میں کتابوں سے سابقہ پڑا ایک ایک

بات کے لئے کتابوں پر کتابیں الٹنا پڑیں ہر ایک موضوع کی تیاری میں کافی تلاش وفکر کرنا پڑتی تھی مولوی صاحب سے پوچھتے کہ یہ چیز کس کتاب میں دیکھیں اس لئے پوچھتے تھے کہ گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جائے۔ مولوی صاحب کام سے جی چرانے کو سمجھتے تھے اس لئے جواب میں فرماتے تھے کہ یہ فن وار کتابوں کی الماریاں آپ کے سامنے ہیں کنجی کا کچھ سمجھئے مطلوبہ شئے کا تعلق کس علم وفن سے ہے۔ اس الماری سے کتاب نکالے تلاش کیجئے۔ مطلب یہ ہے کہ کام کے عادی بنئے اور اپنا کام آپ کیجئے۔

ذہانت کا امتحان

خارج از درس اگر کوئی بات فرمائی بھی تو وہ بھی خالی از فائدہ نہ ہوتی جیسے ایک شعر تاریخی پڑھا پڑھ کر فرمایا سنہ وفات نکالئے سبھی درجوں کے فاضل طلاب جمع ہیں سب دماغ صرف کر رہے ہیں سن وفات کسی طرح نہیں نکلتا۔ شعر حکیم مہدی صاحب مرحوم کے بارے میں تھا "از جائے حکیم بہشت بہ اور سہ مرتبہ نیم نیم کم کن"۔ آخر اس کی تہ تک اپنا ذہن پہنچ گیا اور عرض کیا سن وفات ۱۲۴۸ھ شاعر کے ارشاد کے بموجب ح کو حکم کیا جسکے عدد ۸ ہیں جس کا آدھا ۴ ہے اس کا نصف ۲ اور اس کا نصف ۱ ہو یوں ۱۲۴۸ھ سن وفات قرار پایا مولوی صاحب جواب سنکر بہت خوش ہوئے

اختبار کے بعد اختبار

داخلہ منظور ہو کر رجسٹر میں نام درج ہو گیا درجہ میں پہنچے فرمایا یوں تو سب آپ افاضل ہیں صدر الافاضل، ممتاز الافاضل، فخر الافاضل ہیں بہر حال ذرا تھوڑا تھوڑا قرآن پڑھ کر سنائیے اس لئے کہ تجربہ میں ہے کہ مولوی قرآن غلط پڑھتا ہے دوسرے صحیح پڑھتے ہیں اس لئے کہ یہ قواعد سے پڑھتے ہیں دوسرے پورے زیر زبر سے صحیح پڑھتے ہیں۔ حسب حکم ایک ایک رکوع قرآن پڑھ کر سنایا آخر ہماری طرف سے اطمینان ہوا کہ قرآن صحیح پڑھیں گے۔

مدارس کی چشمک

آدمی عصبانی واقع ہوا ہے اس حد تک عصبیت تو بہتر ہے کہ اپنے تعلق کی بناء پر کسی جنبہ کی جانب اس کی فکر اس کی مدد کی جائے مگر دوسرے جنبہ کو نظر انداز کرنا اس کی کوئی وقعت نہ سمجھنا یہ حد سے تجاوز خود غرضی بیجا تعصب ہے۔ مدارس میں ایسی چشمک چلتی رہتی ہے مولوی صاحب مرحوم نے اس چشمک سے مدرسۃ الواعظین کو ہمیشہ دور رکھا اور اس قصہ کو اسی زمین سے وابستہ رکھا۔ پہلے ہی دن طلاب کے کان کھولتے ہی یہ ارشاد فرما دیتے کہ یہ ناظمیہ سلطانیہ نہیں ہے۔ وہاں کی ہوا دماغ سے نکال دیں۔ یہاں آپ سب ایک ہیں ایک وحدت ہیں ایک ساتھ مل جل کر رہئے پچھلے خواب دیکھنا بھول جائیے مولوی صاحب کا خود برتاؤ سب کے ساتھ یکساں رہا جیسے باپ کا اپنے بیٹوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ میں سلطان المدارس سے فارغ ہو کر آیا دوسرے طلاب ناظمیہ جوادیہ وغیرہ کے تھے خود مولوی صاحب ناظمیہ کے فارغ التحصیل مگر پورے عرصہ تعلیم میں مدرسہ کی بنیاد پر کوئی شاخسانہ نہیں اٹھا بلکہ کبھی لفظی جاطہ بھی آپس میں ہنسی مذاق کے طور پر نہیں ہوا۔

پچیس گھنٹے کام کیجئے

مولوی صاحب نہ وقت کو ضائع ہونے دیتے تھے نہ طلاب کے لئے چاہتے تھے کہ ذرا بھی وہ وقت ضائع کریں۔ فرماتے تھے دن رات مل کر چوبیس گھنٹے ہوتے ہیں آپ پچیس گھنٹے کام کیجئے مطلب یہ کہ ایک منٹ ضائع نہ ہو اور اس کے لئے فرماتے تھے کہ یہاں اس عرصہ میں جتنا چاہئے دیکھئے پڑھئے لکھئے۔ پھر یہ وقت فرصت نصیب نہ ہوگا۔

شاگرد کی تعظیم

زمانہ تعلیم میں نام کے ساتھ مولوی کا لفظ ضروری تھا مولوی صاحب کے نزدیک سب افاضل میں شمار تھے۔ تین سال تمام ہونے اور کامیاب ہونے پر جب شعبہ تبلیغ میں کوئی شاگرد پہونچا تو اس کا مرتبہ بڑھ گیا اب اگر وہ دورہ تبلیغ سے واپس مرکز پر آیا اور مولوی صاحب کو سلام کرنے درجہ میں حاضر ہوا تو اس کو دیکھتے ہی مولوی صاحب اپنی کرسی سے اٹھ جاتے تھے شاگرد شرمندہ ہوتا ارے مولوی صاحب یہ کیا کر رہے ہیں تو فوراً جواب میں فرماتے کہ ہم تعظیم وقدر نہ کریں گے تو دوسرے کیا کریں گے۔ یہ اس لئے ہے کہ دوسرے دیکھیں اور تعظیم کرنا سیکھیں۔

نامور تلامذہ

سب سے پہلی جماعت جو مولوی صاحب کی تربیت پاکر منظر عام پر آئی۔
اس میں مولانا شیخ ضیاء علی صاحب واعظ مرحوم اور مولانا سید نجم الحسن صاحب مرحوم کراروی واعظ (مولف ذکر العباس و چودہ ستارے وغیرہ) اول الذکر جنوب ہند کرناٹک میں بنگلور بلکہ مدراس میسور کے پورے علاقے میں آج اپنے تبلیغات اپنی دینی خدمات سے معروف ہیں اور آخر الذکر کو مومنین پشاور کے پیہم تقاضوں پر مولوی صاحب نے اپنی جگہ پر بھیجا تھا جہاں پوری عمر آپ نے دینی خدمتوں میں گذاردی ہے اور پاکستان، ہندوستان میں آپ کا نام مشہور ہے۔ آپ کی کتابیں تقریباً تمام قومی مکتبوں میں آج موجود ہیں۔

آخری جماعت پہ تمیں عمر میں خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری صاحب قبلہ مرحوم کی تھی جو مولوی صاحب سے پوری پرورش پاکر نکلی اور قوم کے سامنے آئی اس جماعت کے بعد شیر تبلیغ مرحوم شیخ محمد حیدر صاحب کی جماعت تھی جس کی مدت تعلیم

کے مکمل ہونے میں ایک سال کا عرصہ رہ گیا تھا کہ مولوی صاحب نے انتقال فرمایا پہلے دورے سے آخر دور تک کافی حضرات واعظین مولوی صاحب کے پڑھائے کار ہے نامی گرامی ہوئے نکلے جن کے اسامی کا ذکر طول کلام کا اس وقت باعث ہوگا یہاں اتنا ہی کے لئے مختصر عرض کر سکتا ہوں کہ ہر ایک نے اپنے حوالی بھر مولوی صاحب کی سیرت اپنائی اور خوبی پیدا کی ہند و بیرون ہند جہاں گئے جہاں رہے پر وقار رہے نہایت عزت کی زندگی بسر کی۔ مولوی صاحب مرحوم کی زندگی کا اپنانا ہر ایک کے لئے ممکن بھی نہ تھا ورنہ زندگی اجیرن ہو جاتی اس لئے کہ مولوی صاحب میں ایمان اتقاء، احتیاط و عفاف کمال کی حد تک تھا عملی انسان تھے دوسروں کو با عمل دیکھنا چاہتے تھے لیکن لوگوں میں افسوس کہ حد تک فقدان ہی کوتاہی فرائض کی عدم ادائیگی دنیا داری حق تلفی، بد خلقی، دیگر نقائص کا پایا جانا اکثر اظہار واقعی اور صحیح صورت کے بیان پر مجبور کرتا مولوی صاحب اسی میں کڑوے تھے۔ یہ نقد و انتقاد حضرات کو گراں گذرتا تھا مثلاً مومنین میں ایذا رسانی منافرت باہم توہین تذلیل و تحقیر کا عمل دیکھ کر فرماتے تھے سنداً تو یہ حدیث وارد ہوئی ہے کہ "مومن وہی ہے جو برادر مومن کو اذیت نہ پہنچائے" مگر بغیر اسناد و رواۃ ہم تک یہ بات پہنچی ہے کہ مومن وہی ہے جو دوسرے مومن کو اذیت دے، اس طنز و تشنیع کا تحمل قوم کے اندر کہاں ہے وہ تو بدتر حال میں بھی اپنا قصیدہ پڑھوانا چاہتی ہے اسی بناء پر مولوی صاحب اکثر طلاب سے فرماتے تھے کہ میں نے تو کسی طرح کاٹ لی مگر تم سے کہتا ہوں کہ عدیل اختر بننے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ہمیشہ نقصان میں رہو گے۔ یہ زندگی گذارنا دشوار ہو جائے گا۔ سچائی حق گوئی جرأت اظہار صاف بے لاگ بات واقعی تبصرہ تُلی تنقید صاف و پاک اصلاح پسند مزاج کے مظاہر رہے۔ اس واقعی اظہار میں مجھے کوئی باک نہیں کہ تھوڑی بہت سیرت و صفات کی جھلک مولوی صاحب کے سبھی تلامذہ میں ملی اور ملتی ہے لیکن پورے پورے خصوصیات نہ سہی اکثر صفات کی حامل ذات حضرت خطیب اعظم مولانا سید غلام عسکری صاحب

طاب ثراہ کی گذری ہے۔ صحیح معنوں میں آپ اپنے استاد کی مثال اور صفات کے آئینہ دار تھے "الولد سرٌ لابیہ" "بیٹا وہی قدم بقدم ہو جو باپ کے" مولوی صاحب پدر روحانی تھے تذکیہ نفس اور علم و حکمت سے روحانی اولاد کو سنوار کر اپنی مثال بنادیا۔ کیا اللہ کی مصلحت تھی کہ مولوی صاحب مرحوم یہ درخت تیار کر کے رخصت ہو گئے اور اپنی ریاضت کی پھلت بڑھت نہ دیکھی بہر اس وقت آئی جب خواب اجل آچکا تھا بہر حال شاگرد رشید نے صفات استاد کو پیش بھی کیا خصوصیات کی نمائش بھی کی ساتھ ہی وہ حسرتیں یا وہ مکنون خاطر فلاحی اصلاحی باتیں جو گنجائش حاصل نہ ہونے سے گھٹ کر دل میں رہ گئی تھیں ان کو عمل میں لا کر روح کو شاد و خرم فرمایا اور اس مقولہ کو سچ کر کے دکھادیا "اگر پدر نتواند پسر تمام کند" توارث صفت کا عمل پھر بھی جاری ہے اور جاری رہے گا اور یہ توفیض و کرم کی بات ہے جس کے لئے شاعر نے یوں کہا ہے "درخت کرم ہر کجا بیخ کرد۔ گذشت از فلک شاخ بالائے" آج مولوی صاحب مرحوم کے شاگردوں کے شاگرد ہند و پاک دوسرے ممالک میں پھیلے ہیں ان میں بھی مولوی صاحب مرحوم کی کہیں نہ کہیں سے جھلک نظر آئے گی۔ مولانا سید غلام عسکری صاحب وہ شاگرد عزیز و رشید تھے کہ جنھوں نے اپنے استاذ علام سے اپنے رشتہ کو مرنے کے بعد بھی استوار رکھا اور مرتے دم تک ثواب جاریہ سے فراموش نہ فرمایا تاب و طاقت نہ ہونے پر مکتبۂ افادات علامہ عدیل اختر" کا شعبہ نشر و اشاعت قائم کیا اور مولوی صاحب کے کتب و رسائل و افادات کو جو قلمی صورت میں موجود تھے انھیں حتی المقدور چھپوا کر منظر عام پر لائے یوں تحریری افادات کو زندگی دی آج جریدہ عالم پر استاذ و شاگرد کا نام ثبت ہے دونوں سورج و چاند کی طرح چمک رہے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله الذی اعد الجنة للمومنین والمتقین واوقد النار للفاسقین والمنافقین والصلوٰۃ والسلام علی النبی الذی اخبر عن اللہ تعالیٰ انہ لم یجعل التساوی بین المطیعین والعاصین فقال افنجعل المسلمین کالمجرمین وعلیٰ آلہ المعصومین الذین حبہم فارق بین الخبیثین والطیبین لاسیما امیر المومنین الذی ھو میزان الاعمال وباب حطہ فمن احبہ کان من المحبوبین لھم والناجین ومن تنکب عنہ وفارقہ کان من المغضوبین علیہم والھالکین۔

امابعد کائنات پر نظر ڈالنے سے پہلے یہ امر بالکل عیاں نظر آتا ہے کہ سارے عالم کا نظام محبت و عداوت، الفت و نفرت، جذب و دفع سے مرتبط اور قائم ہے اور دو متجانس یا متناسب کی محبت اور کشش اتنی ہی ضروری اور مفید ہے، جتنی دو ناجنس یا نامتناسب کی جدائی نفرت اور ایک دوسرے سے دوری، یہاں تک کہ حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ

"الارواح جنود مجندہ فما تعارف منہا ائتلف وما تناکر منہا اختلف"

(مشکوٰۃ، ص۴۲۵، باب الحب فی اللہ)

جس سے اس سلسلہ کی ابتدا انسانی خلقت یعنی عالم ارواح سے ہی معلوم ہوتی ہے اور جب انسان عالم وجود، دنیا میں قدم رکھتا ہے اس وقت سے تو قانون محبت ہی کی دنیا میں پلتا بڑھتا، تربیت پاتا، پھولتا، پھلتا ہے۔ ماں باپ کی محبت پرورش کرنے والوں کی الفت کسی توضیح کی محتاج نہیں، بقا وارتقاء کے لئے مضر، مہلک اور تمام نقصان رساں عناصر سے دوری، پرہیز اور نفرت عقلی اور فطری لازمہ ہے، معاشرتی، ملکی، شخصی، نوعی، دنیاوی، دینی غرض ہر شعبہ حیات میں کچھ کا محبوب اور کچھ کا مبغوض ہونا بدیہی ہے۔

محبت و عداوت کا معیار

مجانست اور فائدہ مند ہونا یا صاحب جمال و کمال ہونا محبت کا محرک اور اس میں استحکام کا باعث ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ناجنس اور مضر ہونا، ناقص اور قبیح ہونا نفرت و عداوت کا سبب اور بے اتفاقی پر قائم رہنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ سچی محبت اور اخلاص کبھی ناکارہ اور شریر عناصر سے نہ تو پیدا ہو سکتی ہے اور نہ باقی ہی رہ سکتی ہے اور دلی نفرت یا واقعی عداوت باکار اور حسین افراد سے نہ وجود میں آسکتی ہے نہ اس کو بقا حاصل ہو سکتی ہے۔

سچی اور جھوٹی محبت وعداوت

لیکن جب ہم عام پر نظر ڈالتے ہیں تو بظاہر اس کے خلاف مثالیں بھی دکھائی دے جاتی ہیں۔ اس کا سبب یہ نہیں کہ واقعاً حسن قابل عداوت اور قبح لائق محبت ہوگیا ہے بلکہ وہاں فطرۃ اللہ پر گرد و پیش کے حالات اور ماحول و تربیت کے تاثیرات نے پردے ڈال دیئے اور عقل سلیم کو جذبات اور خود غرضیوں نے زنگ آلود کرکے خواہشات نفسانیہ کے قید خانے میں محبوس کردیا ہے، ایسی حسین بیہودہ حرکات وسکنات عاقلانہ گفتار و کردار مخلوط اور مشتبہ بن جاتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کی جگہ پر غاصبانہ قابض ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ ظلم نہ ہو تو حسین ہی محبوب بنے گا اور قبیح ہی مبغوض ہوگا اور جب بھی ڈالے ہوئے پردے چاک کردیئے جائیں گے حسین ہی تخت محبت پر جلوہ افروز ہوگا، قبیح ہی بغض کے قعر مذلت میں گرا ہوگا۔ سرور کائنات کی مشہور حدیث ہے: **ما من مولود الا یولد علی الفطرة فابواه یهودانه او ینصرانه او یمجسانه،**

(مشکوٰۃ کتاب الایمان فی القدر)

واضح کررہی ہے کہ فطرۃ اللہ کا تقاضا کچھ اور ہے اور تربیت کے تاثیرات کچھ اور، خدائی رنگ اور ہے اور مصنوعی ڈھنگ اور۔

کھرے اور کھوٹے میں تمیز کی ضرورت

جب یہ امر واضح ہوگیا کہ الفت ونفرت فطری آثار اور حسن وقبح اس کے اصلی اسباب ہیں لیکن دنیا میں اس کے خلاف مثالیں بھی نظر آتی ہیں تو ضروری ہوگیا کہ مطابق واقع اور خلاف واقع میں تمیز کے لئے کوئی معیار مقرر کرلیا جائے اور کسی محبوب کا حق چھین کر کسی مبغوض کو نہ دے دیا جائے حقدار کا تاج نالائق کے سر نہ کردیا جائے حقیقت اور فریب میں امتیاز پیدا کیا جائے۔ علی الخصوص جب محبت وعداوت کی مذہبی حیثیت ہو اور اس سے نجات و ہلاک ابدی کا تعلق ہو تو چھان بین میں، زیادہ کدو کاوش اور تحقیق وتلاش میں زیادہ اہتمام وکوشش لازم ہوگی۔

قرآن مجید میں محبت اور عداوت کا امر

جب ہم قرآن مجید کے آیات میں تفکر کریں تو ہم کو محبت وعداوت کے قانون کی غیر مشتبہ تعلیم وہاں بھی نظر آئے گی اور اس طرح اس کی مذہبی اہمیت درجہ کمال کو پہنچ جاتی ہے اور ایسا ہونا مقتضائے عقل وفطرت بھی ہے، سورۂ فاطر کے پہلے رکوع میں یہ آیت موجود ہے: "**ان الشیطان لکم عدو فاتخذوه عدوا**"

فاطر ع ۱

جس سے واضح ہے کہ وہ شیطان کسی مگر اس کی عداوت کا حکم ہے اور مصرح ہے۔ یہ سوچ لینا مفید نہیں کہ وہ اپنی جگہ جو ہو ہم کو کسی سے عداوت کی کیا ضرورت اور آیۂ

"قل لا اسئلکم علیه اجرا الا المودة فی القربی"

شوری/۲۳

اس سے واضح ہے کہ قرباء کی محبت بھی مامور ہے، یعنی قرآنی نظریہ غیر مشتبہ ہے کہ کچھ وہ ہیں جن سے عداوت رکھنا فرض ہے اور کچھ وہ ہیں جن سے محبت رکھنا فرض ہے، اسی طرح

"ان اللہ لا یحب الکافرین" (آل عمران/۳۲)

"واللہ لا یحب الظالمین" (آل عمران/۵۷)

"یحب التوابین و یحب المتطہرین" (بقرہ/۱۶۵)

"لا یحب کل کفار اثیم" (بقرہ/۲۷۵)

"لا یحب الفساد" (بقرہ/۲۰۵)

اور اس قسم کی آیتوں سے یہ نمایاں ہے کہ خود خالق محبت کے نزدیک کچھ چیزیں محبوب اور کچھ مبغوض ہیں۔

"والذین امنوا اشد حبا للہ اور لا تجد قوما یومنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد اللہ و رسولہ"

(مجادلہ/۲۲)

سے قائل مدح محبت کی مدح اور لائق قدح کی قدح نمایاں ہے۔

احادیث اور حب و بغض کا حکم

قرآن مجید کے بعد جب ہم آثار و اخبار کی سیر کرتے ہیں تو وہاں حب و بغض کی مذہبی حیثیت اور ان کے احکام و نتائج کی زیادہ تفسیر و تفصیل ملتی ہے چنانچہ صاحب جامع الاخبار نے "الحب فی اللہ والبغض فی اللہ" کی مستقل فصل قائم فرمائی ہے اس میں "والذین امنوا اشد حبا للہ"

(بقرہ/۱۶۵)

کے بعد سورۂ مائدہ کی اس آیت کو نقل فرمایا ہے۔

"یا ایها الذین امنوا لا تتخذوا الیہود والنصاری اولیاء بعضهم اولیاء بعض و من یتولهم منکم فانه منهم"

(مائدہ/۵۷)

جس سے واضح ہے کہ کچھ قوم ایسی ہے جس کی محبت ممنوع ہے اور اس کی خلاف ورزی کے نتیجہ میں ممنوع المحبة سے محبت رکھنے والا، خود اسی کے ساتھ محسوب و محشور ہو جاتا ہے، اسی فصل میں ایک حدیث قدسی نقل فرمائی ہے۔

"اوحی اللہ تعالی الی موسی علیه السلام هل عملت لی عملا قط قال الہی صلیت لک و صمت و تصدقت و ذکرت لک فقال ان الصلوات لک برهان والصوم جنة والصدقة ظل والذکر نور فای

عمل عملت لی فقال موسی دلنی علی عمل و لک
فقال یاموسی هل والیت لی ولیا و هل عایت لی
عدواً قط فعلم موسی ان احب الاعمال الحب فی
الله والبغض فی اللّٰہ"

پروردگار نے حضرت موسیٰ پر وحی کی کہ تم نے کوئی عمل کبھی خاص میرے واسطے بھی کیا جناب موسیٰ نے عرض کی خدایا نماز بھی تیرے ہی لئے پڑھی، روزہ بھی، صدقہ بھی، ذکر بھی سب تیرے ہی لئے تو کیا حکم ہوا کہ نماز تو تمہارے واسطے برہان اور روزہ سپر اور صدقہ سایہ اور ذکر نور ہے۔ یہ بتاؤ کہ پھر میرے لئے کیا کیا۔ اب جناب موسیٰ نے سوال کیا کہ خدایا تو ہی اب بتادے کہ تیرے لئے کون سا عمل ہے، ارشاد ہوا کہ موسیٰ کبھی کسی سے میرے لئے محبت اور میری وجہ سے دشمنی بھی کی ہے اس وقت جناب موسیٰ پر واضح ہو گیا کہ خدا کو تمام اعمال سے زیادہ محبوب حب فی اللہ اور بغض فی اللہ ہے۔

اور صاحب مشکوٰۃ نے بھی ایک خاص باب الحب فی اللّٰہ ومن اللّٰہ قائم کیا ہے اس میں ایک روایت ابن عباسؓ سے مروی ہے:

"عن بن عباس قال قال رسول اللّٰہ صلی
اللّٰہ علیه و سلم لابی ذریا اباذر ای عری الایمان
اوثق قال اللّٰہ و رسوله اعلم قال الموالاة فی اللّٰہ
والبغض فی اللّٰہ"

اس سے بھی واضح ہے کہ حب فی اللہ اور بغض فی اللہ کس درجہ اہم چیزیں ہیں۔ دوسری روایت اس طرح ہے:

"قال اتدرون ای الاعمال احب الی اللّٰہ
تعالی قال قائل الصلوة والزکوة و قال قائل الجهاد
قال النبی صلی اللّٰہ علیه و آله وسلم ان احب

الاعمال الی اللّٰہ الحب فی الله و البغض فی اللّٰہ"

تیسری روایت میں ہے:

"المرء مع من احب"

(جو جس کو دوست رکھے گا وہ اسی کے ساتھ محشور ہوگا)

ان احادیث اور اخبار کو دیکھئے حب اور پھر فی اللہ اور بغض خصوصاً فی اللہ کا کیا پایہ ہے اور اس کی حد کہاں تک پہنچتی ہے۔

محبت اور عداوت میں احتیاط لازم ہے

اب تو کسی کو اس باب میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنا چاہئے کہ نہ صرف عقلی اور فطری اعتبار سے بلکہ قرآن وحدیث کے لحاظ سے بھی کچھ چیزیں قابل محبت اور کچھ قابل نفرت ہیں اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ خدا اور رسول کے نزدیک تمام اعمال سے زیادہ اہم اور محبوب عمل اور سب سے زیادہ افضل عبادت، لائق محبت سے محبت اور قابل نفرت سے نفرت وعداوت رکھنا ہے اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جو جس کو دوست رکھے گا وہ اسی کے ساتھ محشور ہوگا۔

اور یہ ظاہر ہے کہ جس طرح اہل کی مودت ومحبت ضروری ہے اگر اس سے انحراف کیا گیا یا نااہل کی عداوت کے بجائے اس سے محبت کی گئی تو یہ بات نہ صرف دنیا ہی میں قابل ملامت ہے گی بلکہ عاقبت میں بھی حسرت وندامت کا سبب بن جائے گی۔

ولایت جیسی مسائل میں لہٰذا بڑی احتیاط کی ضرورت ہے کہ ایسا نہ ہو جن کی محبت ضروری ہے ان سے غفلت ہوجائے یا جن سے عداوت لازم ہے ان کی محبت میں گرفتار ہوجائے۔

اصحاب اور ان کی محبت اور عداوت کا مسئلہ

اس وقت تمام ان افراد کا استقصا مقصود نہیں ہے جن سے محبت لازم ہے اور نہ تمام ان ذوات کا احصا مطلوب ہے جن سے نفرت ضروری ہے، اعتقاد واعمال کے علاوہ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، سارے عالم میں محبت ونفرت کا قانون جاری وساری ہے اور اس کے واسطے اصول وقواعد مقرر ہیں اور ہر مذہب وملت بلکہ ہر مذہب گروہ کے نزدیک بھی محبوب ومبغوض کا فرق اور ان کی مدحت وشرط معلوم ومبین ہے اور اگر جنبہ داری سے علیحدہ ہوکر عقلی طریقہ پر اصحاب کی محبت کا معاملہ بھی دیکھا جائے تو فیصلہ نہایت آسان ہے۔ مگر ایسا نہ ہوا اور اس مسئلہ نے امت میں اختلاف کی بڑی وسیع خلیج قائم کردی، ایک دوسرے پر الزام دیتا ہے ایک دوسرے کی مخالفت میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا، زبانی جنگ وجدل سے بڑھ کر قتل ومقاتلہ تک کی نوبت آئی اور آتی رہتی ہے اور ٹھنڈے دل سے غور کرکے واقعی نتیجہ تک پہنچنے کی سعی نہیں کی جاتی ہے۔

چونکہ ہم شیعیان امامیہ اثناعشریہ نہ تو تمام اصحاب کو معصوم سمجھتے ہیں نہ سب کو خاطی، نہ سب کو **محفوظ عن الخطا** سمجھتے ہیں، نہ سب کو سرتاپا گناہ، نہ سب کو عادل مانتے ہیں، نہ کل کو فاسق، نہ کل کو مومن مانتے ہیں، نہ کل کو فاجر اس بنا پر ضرورت تھی کہ ان اصحاب میں جن کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہے چند ایسے اصحاب کے حالات بڑی بڑی کتابوں سے منتخب کرکے طلاب اور عام شیعہ اصحاب کے سامنے رکھ دیں جن سے ہم محبت رکھتے اور محبت رکھنا ضروری سمجھتے۔ اگرچہ ایسے اصحاب کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے مگر بہرحال اضافی حیثیت سے کم ضرور ہیں۔ المختصر شیعہ اصحاب میں سے کچھ

حضرات کے حالات فی الحال مد نظر تحریر ہیں۔ زمانہ نے موقع دیا تو انشاء اللہ اور حضرات کے حالات بھی شائع کیے جائیں گے۔ اس طرح علاوہ ادائے حق محبت کے یہ امر بھی واضح ہو جائے گا، ہم پر جو یہ تہمت لگائی جاتی ہے کہ ہم کل اصحاب کو نہیں مانتے اس فریب کا پردہ چاک ہو جائے اور روشن ہو جائے کہ اگر چہ ہم ان تمام کے تمام اصحاب کو جنہیں اصحاب کہا جاتا ہے نہیں مانتے ہیں۔ جن کے ایمان وعمل صالح سے ہم مطمئن ہیں ان کو مانتے بھی ہیں جو آپ اپنی نظیر ہے جو محبت کے اہل ہیں ان سے محبت واجب جانتے ہیں ان سے عداوت گناہ اور جو عداوت ونفرت کے لائق ہیں ان سے عداوت کو ثواب جانتے ہیں اور ان سے محبت کو گناہ خیال کرتے ہیں۔

لیکن قبل اس کے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعض ایسے سوالات کے جوابات بھی واضح ہو جائیں جن سے محبت وعداوت اصحاب کے مسئلہ پر کافی روشنی پڑ سکے۔ اس کی ضرورت اس لئے اور بھی ہوتی ہے کہ ہمارے مخالفین بلا استثناء تمام صحابہ کو یکساں یا سب کی محبت وفضیلت کو ضروری مشہور کرتے ہیں لیکن جیسے کہ آئندہ معلوم ہوگا۔

صحابی کہتے ہیں ہر اس مسلمان کو جس نے رسول کو دیکھا ہو اگر چہ ایک لحظہ کیلئے تو کیا ہر ایسے شخص کی محبت وتوصیف لازم ہے یا ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، آئندہ کے بیانات اس کی پوری توضیح اور اس کا ثبوت ہیں۔ بے شک ان میں سے خاص خاص افراد جو ایمان وعمل صالح کے زیور سے آراستہ رہے وہ قابل توصیف ومحبت ہیں۔

مساوات وعدم مساوات

یہ تو ظاہر ہے کہ خداوند عالم نے اچھے برے کی تمیز کے لئے انسانوں کو میزان عقل عنایت فرما کر اشرف المخلوقات کے معزز لقب سے عزت بخشی ہے لیکن کیا تمام انسان صرف اس لئے کہ انسان ہیں مساوی ہیں اور ان میں آپس میں گفتار و کردار کے اعتبار سے کوئی پستی وبلندی نہیں ہے۔ کیا عالم وجاہل انسان برابر ہے "**هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون**"

(زمر ۹)

کیا مطیع اور عاصی برابر ہے۔ "**افنجعل المسلمين كالمجرمين مالكم كيف تحكمون**"

(قلم ۳۶)

کیا مومن وفاسق برابر ہے۔ "**افمن يهدى الى الحق احق ان يتبع امن لا يهدى الا ان يهدى فما لكم كيف تحكمون**" (یونس ۳۵)

عام انسانوں سے آگے بڑھئے کیا تمام انبیاء برابر ہیں "**تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض**"

(بقرہ ۲۵۳)

جب انسانوں میں امتیاز وتفضل قائم ہے تو اصحاب اس کلیہ سے کیونکر باہر ہو سکتے ہیں۔ آخر وہ بھی تو انسان ہی ہیں اور جب سب میں مساوی نہیں ہے تو سب سے یکساں مودت وعقیدت کیونکر ممکن یا مامور بہ ہو سکتی ہے اس واسطے اصحاب میں بھی

فرقِ مراتب واحتیاط کی ضرورت ہے اور یہی بات کھٹک کی ہے۔ یعنی جب اصحاب کا معاملہ آئے تو چپ ہو جاؤ بھلا یہ خلاف حکم عقل و قرآن سب کو کیسے تسلی دے سکتی ہے۔

یہاں پر یہ لطیفہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اصحاب سے مراد اس گفتگو میں سرور کائنات احمد مجتبیٰ، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب ہیں جہاں زبان بندی ہے ورنہ حضرت عیسیٰؑ کے اصحاب کچھ اچھے کچھ برے تھے کہنے کوئی اعتراض نہیں، جناب موسیٰؑ کے تمام اصحاب یکساں نہ تھے کہنے کوئی مضائقہ نہیں، دوسرے اور انبیاء علیہم السلام کے اصحاب میں فرقِ مراتب کے قائل ہو جیئے کوئی قدغن نہیں لیکن ادھر سرورِ عالم صلعم کے اصحاب میں فرقِ مراتب کا ذکر آیا اور قائل یا ذکر گردن زدنی ہو گئے۔

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

خلاصہ یہ کہ یہ امر تو محتاجِ بیان نہیں کہ سرور کائنات کی تشریف آوری تعلیم اور ہدایت سے عالم میں ایک حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گیا۔ انسانیت اور تمدن کہاں سے کہاں پہنچ گئے (اگر یہ کہنا صحیح ہو کہ تہذیب و تمدن کا کچھ رہ بھی گیا تھا) آپ تشریف لائے اور باران رحمت بن کر برسے لیکن عقلی شرط صلاحیت کے موافق جس میں قبولیت کا جتنا مادہ تھا اس نے ان سے اتنا ہی اثر لیا۔

باران کہ در لطافت طبعش خلاف نیست   در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

ابرِ نیساں برستا تو یکساں ہے مگر جو قطرہ شکمِ صدف میں آتا ہے درِ غلطاں بن کے نکلتا ہے لیکن جو دہن مار میں جاتا ہے سم قاتل بن جاتا ہے "**فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا**" (بقرہ ۱۰/۱)

آفتاب کی نور افشانی میں کوئی کمی نہیں لیکن جن معادن میں وزن و رنگ جذب کرنے کی جتنی صلاحیت ہے وہ کان جواہر ہو جاتے ہیں اور جہاں صلاحیت مفقود ہے جیسے روزِ اول پتھر تھے آخر تک پتھر کے پتھر ہی رہ جاتے ہیں اس میں نہ

بارانِ رحمت کی طرف سے کوئی کمی ہے نہ آفتاب عالمتاب کی جانب سے۔ کیا نااہل کی نااہلی سے بارش یا آفتاب کی کوئی اہانت ہو جاتی ہے؟ کیا لالہ و گل کی تمکنت زر و جواہر کی ندرت یا بارش اور آفتاب میں عیب لگتا ہے؟ حاشا نہ تو خس و خاشاک کہ بنباتات اور پتھروں کی افراط سے بارش کی آبرو بڑھتی ہے، نہ سورج میں چار چاند لگتے ہیں۔ نہ گل و گلزار کی کمی اور لعل و یاقوت کی قلت بارش کی آبرو گھٹاتی ہے یا آفتاب عالمتاب کے شرف میں انحطاط پیدا کرتی ہے۔ مولانا شبلی کے الفاظ ہیں "اسلام ایک ابرِ کرم تھا اور سطح خاک کے ایک ایک چپہ پر برسا لیکن فیض بقدر استعداد پہونچا جس خاک میں جس قدر زیادہ قابلیت تھی اسی قدر زیادہ فیضیاب ہوئی۔ عرب، ایران، افغانستان، ہند، ترکستان، تاتار، مصر، شام، روم سب اس کے حلقہ میں آئے لیکن قبولِ اثر میں سب یکساں نہ تھے، فرقِ مراتب تھا فرق مراتب کی حیثیتیں بھی مختلف تھیں جس قوم میں جس قسم کی قابلیت تھی اسلام نے اس کو اور چمکایا، ترک شجاع تھے، شجاع تر ہو گئے، ایرانی ہمیشہ سے تہذیب معاشرت علوم و فنون میں ممتاز تھے اسلام نے ان کو ممتاز تر کر دیا"

(شعر العجم)

بیشک سرور کائنات رحمۃ للعالمین ہو کر تشریف لائے خدا کا پیغام راحت دائمی اور نجات کلی کا اعلام علی الاعلان فرمایا لیکن فیض بقدر استعداد پہونچا۔ جہاں صلاحیت موجود تھی، ملک، نسل، قومیت، زبان سب کے بے گانگی کے باوجود "**سلمان منا اھل البیت**" کے مرتبت رفیع پہ پہونچے اور جہاں صلاحیت مفقود تھی ساری یگانگی کے باوجود ابولہب "**تبت یدا ابی لھب**" کے قعرِ مذلت میں غرق ہو گیا۔ سچ ہے:

بقول سعدی

پرتوِ نیکاں نگیرد آنکہ بنیادش بد است   تربیتِ نااہل را چوں گردگان بر گنبد است

سرور کائناتؐ اور دیگر انبیاء

قرآن مجید کی ورق گردانی کیجئے مگر امد ھے حافظ کی طرح نہیں بلکہ آنکھیں کھول کے تو آپ کو جگہ جگہ سرور کائناتؐ اور دیگر انبیاء میں تشابہ نظر آئے گا۔ خداوند عالم اپنے حبیب کو جب تسلی دینا چاہتا ہے تو کبھی کسی حاکم دنیا یا سلطان جہاں سے نہیں بلکہ بار بار گذشتہ انبیاء کے واقعات یاد دلاتا ہے

"فان کذبوک فقد کذب رسل من قبلک" (آل عمران/۱۸۴)

"ولقد استهزیٔ برسل من قبلک فحاق بالذین سخروا منهم ما کانوا به یستهزؤن" (انعام/۱۰)

"ولقد استهزیٔ برسل من قبلک" (رعد/۳۲)

"و کذب موسیٰ" (حج/۴۴)

ان آیات سے واضح ہے کہ سرور کائنات کا قیاس اگر کیا جائے تو کسی نبی پر نہ کہ کسی فاتح زمین پر دوسری آیتوں سے بھی اس مطلب پر روشنی پڑتی ہے مثلاً "ما کنت بدعا من الرسل" (احقاف/۹)

(میں کوئی انوکھا رسول تو نہیں ہوں مجھ سے پہلے بھی تو پیغمبر آچکے ہیں)

مجھے بھی انہیں پر قیاس کرو "هذا نذیر من النذر الاولیٰ" (نجم/۵۶)

(یہ محمد بھی اگلے ڈرانے والوں کی قسم کا ایک ڈرانے والا ہے)

"شرع لکم من الدین الخ" (شوریٰ/۱۳)

نوح و ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام سب کے اصول ایک ہی تھے۔

کسی کی تعلیم جبری نہ تھی فقط تعلیم دینا فرض تھا

اب ہم کو ان حضرات کی تعلیم کی طرف نظر دوڑانا چاہئے کہ ان کا طریقہ کیا تھا۔ آیات ملاحظہ ہوں "ما علی الرسول الا البلاغ المبین"

(نور/۵۴)

"ما علی الرسول الا البلاغ"

(مائدہ/۹۹)

"انما علی رسولنا البلاغ المبین"

(مائدہ/۹۲)

"فان تولوا فانما علیک البلاغ"

(آل عمران/۲۰)

"لست علیهم بمصیطر"

(مائدہ/۹۲)

یعنی جملہ انبیاء خواہ آپ سے قبل کے ہوں یا آپ خود سب کا فریضہ اتنے میں ادا ہو جاتا ہے کہ اچھی طرح سمجھا دیں اور بس اب اگر کوئی نہیں مانتا تو انبیاء پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا اور نہ تعلیم میں نقص ہوتا ہے یہ تو اس نہ ماننے والے کی نااہلیت ہے۔

جناب نوح نے تقریباً ہزار برس تک مسلسل تعلیم دی "فما امن معه الا قلیل" غور کرنے والوں کے لئے اتنا ہی کافی ہے حضرت یونسؑ کی تیس برس سے زائد کی محنت میں صرف ملیخا عابد اور روبیل عالم کے سوا کسی نے راہ راست قبول نہ کی تو کیا

اس میں نوحؑ کی تقصیر ہے؟ معاذ اللہ، یونسؑ کی خطا ہے؟ العیاذ باللہ کیا ان حضرات کے اجر میں کوئی کمی ہوگئی؟ تو پھر تو یہ نتیجہ تعلیم میں نقص تھا نہ اجر میں کمی مقصود ہے۔ اصل یہ ہے کہ نالائقوں کی قساوت قلب تھی اور نااہلوں کی شقاوت بس اور بس۔

جناب عیسیٰؑ پر ایمان لانے والوں کی نہایت مختصر تعداد ان میں بھی جلد ہی مرتد ہو جانے والوں کا وجود کیا مسیحؑ کی تعلیم یا آپ کے مراتب میں کوئی نقص پیدا کرتا ہے؟ ہرگز نہیں بس سرور عالم کو بھی اسی طرح دیکھنا چاہیے خواہ کوئی ماننے والے تعداد کم ہو یا زیادہ آپ پر اس کا کیا اثر؟ شرف تو اس کا ہے جو مانے، نالائق وہ ہے جو نہ مانے۔

سرور عالمؐ اور نبی بنی اسرائیل کی تشبیہ

یوں تو آپ کی تشبیہ دیگر انبیاء سے ہوتی ہی چاہیے اور ہے بھی لیکن خصوصیت سے جناب موسیٰؑ سے خداوند عالم نے آپ کو خصوصی تشبیہ دی ہے اور اگر تفصیلی نظر ڈالی جائے تو ان دونوں حضرات اور دونوں کی امت کے حالات میں بہت زیادہ مشابہت ملتی ہے۔

سورۂ مزمل کی اس آیت "**انا ارسلنا الیکم رسولا شاھدا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولا**" (مزمل/۱۵) سے قدرت نے دونوں پیغمبروں میں تشابہ کا اعلان کر دیا ہے۔ الفاظ قرآن میں تشریح تو نہیں کہ کن کن باتوں میں تشابہ ہے لیکن تفاسیر و تواریخ کی سیر بہت سے جزئیات کا پتہ دیتی ہے۔ تاریخ طبری بتلاتی ہے کہ جب جناب موسیٰؑ نکلے تھے تو چھ لاکھ بیس ہزار جنگی جوان ساتھ تھے اور اس میں بیس برس والے کم سن سمجھ کر شمار میں نہیں آئے تھے اور ساٹھ برس والے مسن ہونے کے خیال سے شمار میں نہیں لئے گئے تھے (ورنہ ظاہر ہے کہ تعداد کہیں زیادہ ہو جاتی) لیکن ان میں سے واقعی موسوی تعلیم کے پابند کتنے تھے تاریخ دانوں سے مخفی نہیں قرآن مجید تو "**اذھب انت و ربک فقاتلا**" (مائدہ/۲۴) کی حکایت کر کے بڑا عبرت انگیز منظر پیش فرماتا ہے۔ اب اہل انصاف غور فرمائیں کہ اتنی بڑی تعداد ہونے سے جناب موسیٰ پر کیا اثر پڑتا ہے جبکہ سرور عالم صلعم کے مرتے وقت ایک لاکھ چودہ ہزار یا چوبیس ہزار صحابہ کی تعداد بتلائی گئی ہے اور کیا "**اذھب انت و ربک فقاتلا**" کی آواز بلند کرنے والوں کی جماعت صحابی ہونے کے سبب قابل مدح ہو سکتی ہے؟

اسی جماعت کثیرہ میں دو مرد میدان بھی تھے جو یہ کہتے نظر آتے ہیں قال رجلان من الذین یخافون انعم اللہ علیہما ادخلوا علیہم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غالبون و علی اللہ فتوکلوا ان کنتم مومنین، قالوا یا موسی انا لن ندخلہا ابدا ما داموا فیہا الخ، (مائدہ ۲۳،۲۴/۵)

ان دو بزرگواروں کے مشورے اور اس کا جواب کس قدر حسرتناک ہے۔

غور کیجئے کتنی بڑی جماعت تھی جو دیدار موسیٰؑ سے مشرف ہوئی اور آپ پر ایمان ظاہر کیا، یہ جماعت مرتد ہو سکتی ہے، ایسوں کی کثرت جناب موسیٰ کی نبوت میں چار چاند لگا سکتی ہے اور کیا حقیقی ایمانداروں کی قلت تعداد ان میں کوئی عیب لگا سکتی ہے؟ "و قلیل من عبادی الشکور" (سبا/۱۳)

تشبیہ موسوی میں بڑی عبرت ہے، کاش لوگ غور کرتے۔

جناب موسیٰؑ اور سرور عالمؐ کے حالات کے تمام تشابہ پر غور کرنا اس وقت مقصود نہیں ہے مثلاً دونوں شریعتوں میں جہاد با سیف کا حکم۔ دونوں کے اوصیا میں تشابہ۔ جناب موسیٰ کی غیبت میں گوسالہ پرستی۔ سرور عالم کی غیبت میں امت کا ارتداد وصی جناب موسیٰؑ کا مرتدین سے جہاد نہ کرنا بخوف تفرق ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل وصی جناب سرور عالم کا جنگ نہ کرنا بخوف تفرق وایم اللہ لولا مخافۃ الفرقۃ و ان یعود الکفر ویبور الدین لغیرنا فصبرنا علی بعض الالم

(استیعاب ص۲۰۵ بر حاشیہ اصابہ جزء اول مطبعہ سعادہ مصر ۱۳۲۸ھ، مف العین قبل خلافت امیر المومنین علیہ السلام) وغیرہ۔

اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اصحاب موسیٰؑ کی کثرت یا قلت سے آپ پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو سرور عالمؐ کے اصحاب کی کثرت و قلت آپ پر کیا اثر ڈالے گی۔ "قل ما کنت بدعا من الرسل" (احقاف/۹)

حدیث میں بنی اسرائیل اور اس امت کی تشبیہ

قرآن مجید کے بعد جب ہم احادیث پر نظر ڈالتے ہیں تو تشبیہ ملتی ہے۔

"قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم لیاتین علی امتی کما اتی علی بنی اسرائیل حذو النعل بالنعل حتی ان کان منہم من اتی امہ علانیۃ لکان فی امتی من یصنع ذالک و ان بنی اسرائیل تفرقت علی ثنتین و سبعین ملۃ و تفترق امتی علی ثلاث و سبعین ملۃ کلہم فی النار الا واحدۃ"

جناب رسالتمآبؐ نے فرمایا کہ میری امت میں بھی ضرور ہو بہو ویسا ہی ہوگا جیسا بنی اسرائیل میں، فرض کرو کہ اس امت میں کسی نے اپنی ماں سے علانیہ بدکاری کی ہوگی تو میری امت میں بھی ویسا ہی ہوگا۔

بنی اسرائیل کے بہتر ٹکڑے ہوگئے، میری امت میں بھی ٹکڑے ہوں گے تہتر لیکن صرف ایک نجات پائے گا باقی کل جہنم میں جائیں گے۔

(مشکوۃ باب الاعتصام ص۲۰ مجتبائی دہلی ۱۳۰۷ھ)

اس حدیث سے بھی دونوں حضرات کی امتوں کے حالات کا تشابہ واضح ہے جب دونوں میں حالات کا متشابہ ہونا لازم اور اس تاکید اور شد و مد سے لازم ہے تو ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے اصحاب کی تعداد بہت تھی مگر کچھ ایسے تھے جو باوجود سمجھانے بجھانے کے آپ کی بات نہ مانتے تھے فقط نام کے تھے اور کچھ ایسے جو اپنے ایمان کے پختہ اور آپ کی پہلی آواز پر لبیک کہنے والے تھے تو اس امت میں بھی ایسا

ہی ہوگا اور ضرور ہوگا اور ہوا۔ اگر یہ بات جناب موسیٰ میں عیب نہیں لگاتی تو سرور عالم میں بھی نہیں لگتی اگر اس طرح جناب موسیٰ کی شان نہیں بڑھتی تو آنحضرت کی شان بھی نہیں بڑھتی۔ دونوں امتوں میں بہت سے فرقے ہوں گے دونوں امتوں میں فقط ایک ہی نجات پائے گا دونوں امتوں میں سوائے ایک فرقہ کے سب جہنمی ہوں گے۔

یہاں پر پہنچ کے ایک بار پھر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرور کائنات کی نبوت کے قائل ہو جانے پر اطمینان نہیں ہونا چاہئے بلکہ امتیاز پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ کون نجات پائے گا اور کون ہلاک ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ نجات پانے والے کا ساتھ چھوٹ جائے اور ہلاک ہونے والوں کا ساتھ ہو جائے۔ دوستی میں احتیاط کی ضرورت ہے۔ "فان المرء مع من احب"۔

چونکہ مذکورہ بالا حدیث کے آخر میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پوچھنے والوں نے پوچھا ہے کہ یا رسول اللہ وہ نجات پانے والا کون ہوگا۔

"قال ما انا علیہ و اصحابی" قطع نظر اس سے کہ واقعاً رسول نے یہ فقرات فرمائے یا نہیں اس لئے اب ضروری ہو گیا کہ اصحاب کے معنی ان کے صفات اور حالات ایمان کردار سب کو تمیز کے ساتھ سمجھ لیا جائے اس لئے کہ یا تو سب کا ایک حکم ہو گیا یا بعض کا حکم اور ہوگا اور بعض کا اور چونکہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ہم جن صحابہ سے محبت رکھتے ہیں وہ کم اور ممتاز ہیں کل صحابہ محبت کے لائق نہیں بلکہ بعض سے تو نفرت ضروری ہے۔

صحابی یا اصحاب کس کو کہتے ہیں؟

کسی دعوے کے فیصلے سے قبل اس امر میں بڑی احتیاط اور بڑے اہتمام کی ضرورت ہے کہ دعوے کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے کہ کیا دعویٰ ہے، کتنا ہے، کس کے لئے ہے وغیرہ تب فیصلہ کیا جائے چنانچہ صحابہ کے متعلق بھی دعووں کو سمجھ لینا چاہئے۔ بحث یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد اصحاب کہلانے والوں میں سے کس سے محبت کی جائے کس سے عداوت کی جائے یا سب سے محبت رکھی جائے (سب سے عداوت کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس کا کوئی قائل نہیں)

محبت اور عداوت کے معنی تو مشہور ہیں صرف یہ طے کرنا ہے کہ اصحاب سے کیا مراد ہے، وہ کون لوگ ہیں تعداد کتنی ہے اور ان کے حالات کیا ہیں تا کہ یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ محبت و عداوت یا کس سلوک کا کون مستحق ہے، اصحاب کے معنی بتلانے کے لئے ہم تاریخ ابوالفدا کی عبارت ذیل نقل کرتے ہیں

"قد اختلف الناس فیمن یستحق ان یصدق علیه فقال فكان سعید بن مسیب لا یعد الصحابی الا من اقام مع رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم سنته او اكثر وغزا معه فقال بعضهم كل من ادرك العلم واسلم و رای النبی صلی الله علیه و آله وسلم فهو صحابی ولو انه صحب رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم ساعةً واحدة و قال بعضهم لا یكون صحابیا الا من تخصص به الرسول صلی

اللّٰہ علیہ و آلہ وسلم و تخصص ھو بالرسول صلی اللّٰہ علیہ (و آلہ) وسلم بان یثق رسول اللہ صلی اللّٰہ علیہ (و آلہ) وسلم بسریرتہ و یلازم ھو رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ (و آلہ) وسلم فی السفر و الحضر والاکثر علی ان الصحابی ھو کل من اسلم و رای النبی صلی اللّٰہ علیہ (و آلہ) وسلم و صحبہ و لواقل زمان و اما عندھم علی ھذا القول الاخیر فقد روی ان النبی صلی اللّٰہ علیہ (و آلہ) وسلم سار فی عام فتح مکۃ فی عشرۃ آلاف مسلم و ساء الی حنین فی اثنی عشر الفا و سار الی حجۃ الوداع فی اربعین الفا و انھم کانوا عند وفاتہ صلی اللّٰہ علیہ (و آلہ) وسلم مأۃ الف و اربعۃ و عشرین الفا (واما مراتبھم) فالمھاجرون افضل من الانصار علی الاطلاق و اما التفصیل فسباق الانصار افضل من متاخری المھاجرین و قد رتّب اھل التواریخ الصحابیۃ علی طبقات (فالطبقہ الاولی) اول الناس اسلاما کخدیجۃ و علی وزید و ابی بکر الصدیق رضی اللّٰہ عنھم و من تلاھم و لم یتاخر الی دار الندوۃ (الطبقۃ الثانیۃ) اصحاب دار الندوہ و فیھا اسلم عمرؓ (الطبقۃ الثالثہ) المھاجرون الی الحبشہ (الطبقۃ الرابعۃ) اصحاب العقبۃ الاولی (الخامسۃ) اصحاب العقبۃ الثانیہ (السادسہ) اصحاب العقبہ الثالثہ و کانوا سبعین (السابعۃ) المھاجرون الذین و صلوا الی النبی صلی اللّٰہ علیہ (و آلہ) وسلم بعد ھجرتہ وھو بقباء قبل بناء مسجدہ (الثامنۃ) اھل

بدر الکبری (التاسعہ) الذین ھاجروا بین بدر و الحدیبیہ (العاشرۃ) اھل بیعۃ الرضوان الذین بایعوا بالحدیبیہ تحت الشجرۃ (الحادیۃ عشرۃ) الذین ھاجروا بعد الحدیبیۃ و قبل الفتح (الثانیۃ عشرۃ) الذین اسلموا یوم الفتح (الثالثۃ عشرۃ) صبیان ادرکوا النبی صلی اللہ علیہ (و آلہ) وسلم و راوہ و من الصحابۃ اھل الصفۃ و کانوا اناسا فقراء لا منازل لھم ولا عشائر یاوون علی عھد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ (و آلہ) وسلم فی المسجد و یظلون فیہ و کان صفۃ المسجد مثواھم فنسبوا الیھا و کان اذا تعشی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ (و آلہ) وسلم یدعوا منھم طائفۃ یتعشون معہ و یفرق منھم طائفۃ علی الصحابۃ لیعشوھم"

(ج ۱، ص ۱۵۴، وقائع ۱۱ھ)

ترجمہ لوگوں میں اختلاف ہے کہ صحابی کس کو کہنا چاہیے۔

(۱) سعید بن مسیب تو کسی شخص کو صحابی اس وقت تک نہیں شمار کرتے تھے جب تک کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ (و آلہ) وسلم کے ساتھ کم از کم ایک سال نہ رہا ہو اور آپ کے ساتھ ہو کر جہاد نہ کیا ہو۔

(۲) اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ جو بالغ اسلام لائے اور آنحضرت کو دیکھ لے وہ صحابی ہے خواہ وہ آنحضرتؐ کے ساتھ ایک ساعت ہی رہا ہو اور

(۳) بعض لوگوں نے کہا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک صحابی نہیں ہو سکتا جب تک اس کو رسول صلی اللہ علیہ (و آلہ) وسلم سے اور آپ کو اس سے خصوصیت خاصہ نہ حاصل ہو جس کی صورت یہ ہے کہ آنحضرت کو اس کے باطن پر وثوق اور اعتماد ہو اور وہ شخص آپ کے سفر و حضر میں برابر ہم رکاب رہے۔

(۳) اور اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ صحابی ہر وہ شخص ہے جو اسلام لائے اور آنحضرت کو دیکھ لے اور آپ کی صحبت میں آجائے کبھی کہیں ساتھ ہو جائے تو ساتھ ہو جائے اگرچہ ذرا سی دیر کیلئے ہی کی۔

اس آخری قول کی بناپر صحابہ کی تعداد کی تفصیل حسب ذیل ہے:

آپ نے فتح مکہ کے سال دس ہزار مسلمانوں کے ساتھ سفر کیا تھا اور حنین میں بارہ ہزار لے گئے تھے اور حجۃ الوداع میں چالیس ہزار کے ساتھ تشریف لے گئے اور آپ کی شہادت کے وقت ایک لاکھ چوبیس ہزار تھے۔

اب ان کے مراتب کی تفصیل یوں ہے کہ مہاجرین انصار علی الاطلاق افضل ہیں اور تفصیل کے اعتبار سے یوں ہے کہ سابق انصار متاخرین مہاجرین سے افضل ہیں اور اہل تواریخ نے صحابہ کے طبقات قائم کر دیئے ہیں۔

(طبقہ اولی) سب سے پہلے اسلام لانے والے جیسے خدیجہ، علی، زید، ابو بکر اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے مگر دار الندوہ تک تاخیر نہیں کیا۔

(طبقہ ثانیہ) اصحاب دار الندوہ اس میں عمر اسلام لائے۔

(طبقہ ثالثہ) حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والے۔

(طبقہ رابعہ) اصحاب عقبہ اولی۔

(طبقہ خامسہ) اصحاب عقبہ ثانیہ۔

(چھٹا طبقہ) اصحاب عقبہ ثالثہ جن کی تعداد ستر تھی۔

(ساتواں طبقہ) وہ مہاجرین جو سرور عالم صلی اللہ علیہ (وآلہ) وسلم سے ہجرت کے بعد ملے جب تک آپ قبا میں مقیم تھے لیکن مسجد نہیں بنی تھی۔

(آٹھواں طبقہ) بدر کبریٰ والے۔

(نواں طبقہ) جن لوگوں نے بدر و حدیبیہ کے درمیان ہجرت کی۔

(دسواں طبقہ) بیعت رضوان والے۔

(گیارہواں طبقہ) جن لوگوں نے حدیبیہ کے بعد اور فتح کے قبل ہجرت کی۔

(بارہواں طبقہ) جو لوگ یوم فتح مکہ اسلام لائے۔

(تیرہواں طبقہ) وہ لڑکے جنہوں نے رسول کا زمانہ پایا اور آپ کی زیارت کی۔

اصحاب ہی میں اہل صفہ بھی ہیں یہ کچھ نادار لوگ تھے جن کے نہ کوئی مکان تھا، نہ رشتہ دار رسولؐ کے زمانہ میں یہ لوگ مسجد ہی میں رہتے تھے اور وہیں سوتے تھے۔ مسجد کا صفہ ان کی پناہ گاہ یا خواب گاہ تھا۔ اس وجہ سے صفہ کی طرف منسوب ہو گئے۔ جناب رسالتمآبؐ رات کا کھانا کھاتے تو یہ حضرات بھی آپ کے ساتھ ہوتے اور بعض لوگوں کو بعض اصحاب کے یہاں بھیج دیتے تا کہ وہ وہاں کھا لیں۔

ابو الفدا کی اس عبارت سے ظاہر ہو گیا کہ اولاً تو صحابی کی تعریف قرآن مجید یا حدیث سے ماخوذ نہیں بلکہ مختلف لوگوں نے اپنی اپنی رائے سے جو مناسب سمجھا وہ کہا ہے، کوئی نہ قرآن پیش کرتا ہے نہ حدیث۔ ابو الفدا ہی پر منحصر نہیں دوسرے حضرات بھی صحابی کی اصطلاح کے لئے قرآن و حدیث نہیں پیش فرماتے بلکہ اپنی اپنی رائے بیان فرماتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کہتے تو صحابی صحابی ہیں مگر فیصلہ کچھ نہیں معلوم کہ صحابی آخر کہتے کس کو ہیں، کوئی کچھ کہتا ہے کوئی کچھ۔ تیسری بات یہ ہے کہ صحابہ کی تعداد جو ایک لاکھ چوبیس ہزار کہی جاتی ہے وہ بنا بر اس تعریف کے ہے کہ "جو کلمہ شہادتین ادا کر کے رسول اللہ کو دیکھ لے فقط" چوتھی بات یہ ہے کہ ان کی ترتیب افضلیت اور طبقات کے لئے قرآن و حدیث سے تمسک نہیں ہے بلکہ جس کا جو دل چاہتا ہے وہ طے کرتا ہے۔

یہ لطیفہ بھی کچھ کم نہیں جنتا کہ مراتب قائم کرتے وقت ایک مرتبہ مہاجروں کو علی الاطلاق افضل بھی فرمایا جاتا ہے اور دوسری دفعہ متقدمین انصار سے متاخرین

مہاجرین کو کم رتبہ بھی تحریر فرمایا جاتا ہے۔ نہ جانے معیارِ فضیلت ہجرت یا نصرت ہے یا تقدم و تاخر۔ بہر حال ایمان و عمل صالح کی تو کوئی جگہ قائم ہی نہیں کی گئی۔

اسی طرح جب طبقات قائم کرنے بیٹھتے ہیں تو اول اسلام لانے والوں کو طبقہ دار الندوہ تک کھینچ آتا ہے اور یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان میں کوئی ترتیب افضلیت ہے یا نہیں اور حسب ضرورت اسے گول مول رکھنا ہی مناسب خیال کیا جاتا ہے۔

اسی طرح مراتب و طبقات قائم کرنے کے باوجود غریب اصحاب صفہ کو سوائے صفہ کے اور کہیں جگہ نہیں دی جاتی نہ جانے ان غریبوں کی کیا خطا ہے جو نہ مراتب کے درجہ میں آتے ہیں نہ طبقات کے سلسلہ میں۔

المختصر ابوالفدا کی عبارت سے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عقل و نقل کوئی بھی کل صحابہ کی محبت کو لازم نہیں قرار دے سکتی۔ اس لئے کہ صرف دیدار رسول کسی عقلی و نقلی دلیل سے موجب عصمت یا موجب عدالت یا موجب اتقا یا موجب ورع و زہد یا موجب بقاء بر اسلام یا موجب خلوص یا موجب عدم ارتداد یا موجب مساوات جمیع دیدار کنندگان نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی مدعی ہو سکتا، ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ دیکھنے والوں میں سے کچھ لوگ مرتد بھی ہوئے دیکھنے والوں میں بکثرت منافق بھی ہوئے دیکھنے والوں میں کتنے ایسے تھے جو ہرگز مخلص نہ تھے۔ دیکھنے والوں میں فساق کی بھی کوئی کمی نہ تھی ان کے نام اور احوال کی تفصیل بڑی بڑی کتابوں میں مذکور ہے یہاں بھی بطور نمونہ کچھ ذکر ہوگا۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ صحابی کی تعریف ہی اصل چیز ہے جب یہ طے ہو جائے گا کہ صحابی کس کو کہتے ہیں تو اس کے ساتھ کیسا سلوک کرنا چاہئے یہ بات نہایت آسان ہو جائے گی صاحب اسد الغابہ علامہ ابن اثیر جزری نے محمد بن اسماعیل صاحب بخاری کے نزدیک صحابی کی تعریف یہ لکھی ہے:

"من صحب رسول الله صلعم او رآه من المسلمین

فهو من اصحابه"

اس تعریف پر کبھی ہنسی آتی ہے، کبھی تعجب ہوتا ہے اور اس سادہ لوح جماعت کی حالت قابل رحم نظر آتی ہے جو ایسے متزلزل اور غیر متعین مفہوم پر حکم لگانے میں، ایڑی چوٹی کا زور صرف کرتے ہیں۔

اضطرار ابو یا اختیار اُس تعریف میں وہی اشتباہ واجمال کار فرما ہے جو کمزور دعوؤں میں ہوا کرتا ہے اور جو مشکوک اور غیر قطعی ہوتے ہیں۔ صحابی کی تعریف میں **من صحب** کہنا کس قدر پر لطف ہے یعنی صحابی وہ ہے جو صحابی ہو "**سبحان الله من صحب او رآه**" کے درمیان "او" بتلاتا ہے یہ دو چیزیں ہیں جن میں سے کسی ایک کا تحقق صحابی ہونے کو کافی ہے لیکن صحب کے بعد "رآہ" کہنا محض فضول ہے کیونکہ رویت میں حقیقی اور تقدیری پہلے سے شامل ہیں تاکہ ابن مکتوم کا قضیہ واضح رہے وہ تو لازمی ہوگی ہی۔ اب راہ کا بڑھانا عبث نہیں تو اور کیا ہے۔ دوسری طرف جب صحبت میں کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ کسی وقت کی تعیین نہیں تو رویت کے بعد صحبت کی لفظ کہنے سے کیا نتیجہ وہی مطلب جو ابوالفدا کی اکثریت کا تھا وہی آ گیا، اس کے لئے جو کچھ وہاں عرض کیا گیا یہاں بھی وہی عرض ہے۔

صاحب اسد الغابہ نے اسی بحث میں قاضی ابوبکر محمد بن الطیب کا قول لکھا ہے وہ بھی پر لطف ہی ہے وہ فرماتے ہیں "اہل لغت میں اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ صحابی صحبۃ سے مشتق ہے اور وہ صحبت کی کسی مقدار مخصوص سے مشتق نہیں بلکہ وہ اس شخص کے حق میں جاری ہے جو صحبت میں رہے خواہ قلیل ہو خواہ کثیر اور کل افعال سے جو نام مشتق ہوتے ہیں ان سب کا حال یہی ہوتا ہی ہے اسی بنا پر **صحبت فلانا حولا و شهرا و یوما و ساعة** کہا جاتا ہے لہٰذا صحبت کا اطلاق کثیر و قلیل سب کے لئے ہوتا ہے، یہاں تک تو لغوی تحقیق ہوئی اب اصطلاح کی نوبت آتی ہے تو فرماتے ہیں" باوجود اس کے امت میں عرف مقرر ہو گیا ہے کہ وہ لوگ اس نام (صحابی) کو استعمال نہیں کرتے مگر صرف ان لوگوں کے حق میں جنکی صحبت زیادہ رہی

ہو اور اس کے سوا کہ جس کی صحبت زیادہ ہو کسی کے لئے اس کے استعمال کو جائز نہیں قرار دیتے چنانچہ جس نے آپ سے ایک ساعت ملاقات کی یا آپ کے ساتھ چند قدم چلا یا آپ سے کوئی حدیث سن لی اس کو صحابی کہنے کی اجازت نہیں دیتے، لہٰذا واجب ہے کہ یہ نام اس کو نہ دیا جائے جس کے حالات یہ ہوں یعنی صرف مل لینا یا دیکھ لینا یا چند قدم چل لینا وغیرہ

<u>لیکن ان سب کے باوجود اگر کوئی موثق اور امین ایسے شخص سے روایت کرے تو وہ مقبول ہے۔</u>

یہ خط کشیدہ الفاظ غور کے لائق ہیں کہ نہ تو یہ شخص صحابی کہلا سکتا ہے نہ سرورِ کائنات کے ساتھ کچھ دن بھی رہا ہے نہ اس کے متعلق یہ کچھ قید ہے کہ اس نے کچھ سیکھا یا پہلے اعتقادات بدلے اس کا ذہن، عقل، دماغ قبل اسلام کے خیالات سے فارغ ہوا اس کے دل میں ایمان اترا یا ابھی صرف زبان ہی پر ہے وہ مرتد ہو سکتا ہے یا نہیں لیکن اس کی روایت مقبول اور معمول بہا اللہ ہی جانے کہ راوی عنہ کا اعتبار ہے کہ مروی عنہ کا یا کوئی اور مقصد ہے۔

اچھا اگر روایت مقبول بھی ہو گئی تو ان کی تعظیم و محبت کا حکم ان کے اعمال و افعال میں کسی برائی کا احتمال نہ ہونا۔ ان کا علی الاطلاق ممدوح ہو جانا ان کا عادل ہو جانا وغیرہ کس طرح ضروری ہو جائے گا۔ فی الحال تو وہ صحابی کی عالمگیر تعریف سے بھی باہر ہیں۔ جناب قاضی صاحب آپ کو اختیار ہے جس کی روایت مانئے جس کو چاہے محترم کہئے لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس درجہ خلاف عقل حکم میں جو آپ کا ہمنوا نہ بنے اسے ملعون قرار دیجئے۔

حق یہ ہے کہ صحابہ کے متعلق اس قسم کے اختلاف اور ایسے متضاد حکم لگائے جاتے ہیں جن پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے، کبھی تو سارے کے سارے "لا تذکروا اصحابی الا بخیر" کے کامل بنا دیئے جاتے ہیں کبھی سارے کے سارے عدول قرار

دے دیئے جاتے ہیں، کبھی سارے کی محبت واجب کر دی جاتی ہے، کبھی سب کی تعظیم لازم بتائی جاتی ہے، کبھی سب کا جنتی ہونا طے کر دیا جاتا ہے، کبھی سارے احکام الٹے بھی نظر آنے لگتے ہیں۔ کسی کی ہاتوں سے خبر دی جاتی ہے، کسی کی دروں سے ضیافت کی جاتی ہے، کسی کو جلا وطن کیا جاتا ہے، کسی کو قتل اللّٰہ کہا جاتا ہے۔ کسی کی ہڈیاں، پسلیاں توڑی جاتی ہیں، اللہ جانے یہ گورکھ دھندا کیسے کھلے گا اور کب۔

علامہ ابن حجر نے اصابہ میں لکھا ہے:

"اصح ما وقفت علیه من ذالک ان الصحابی من لقی النبی صلی الله علیه و آله وسلم مومنا به و مات علی الاسلام فیدخل فیمن لقیه من طالت مجالسته له او قصرت و من روی عنه او لم یرو و من غزا معه او لم یغزو من راه رویة و لو لم یجالسه و من لم یره لعارض کالعمی"

سب سے زیادہ صحیح تعریف جو مجھے معلوم ہو سکی ہے یہ ہے کہ صحابی اس کو کہتے ہیں جس نے آنحضرت صلعم کی ملاقات کی ہو درآنحالیکہ وہ مومن ہو اور مسلمان مرے اب جن لوگوں نے ملاقات کی ہے ان میں وہ بھی داخل ہے جس کی ہم نشینی طویل ہو جس کی ہم نشینی کم ہو آپ سے اس نے روایت کی ہو، نہ کی ہو۔ آپ کے ساتھ جہاد کیا ہو نہ کیا ہو چاہے آپ کے پاس بالکل نہ بیٹھا ہو بلکہ ذرا سا دیکھ لیا ہو اور وہ بھی جس نے کسی عارضہ کے سبب نہ دیکھا ہو مثلاً نابینائی کے سبب۔ اس بیان کا نتیجہ بھی وہی ہے جو ابو الفداء کے بیان کا ہے اور اس پر بھی وہی تبصرہ ہوتا ہے جو ابو الفداء کے بیان پر ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اصابہ ہو کہ اسد الغابہ ابو الفداء ہو کہ ابن اثیر بخاری کے قول کے سامنے کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی خواہ وہ ماننے کے لائق ہو خواہ نہ ہو۔

اب ہم کتاب "اسوۂ صحابہ" شائع کردہ اعظم گڑھ دار المصنفین کی طویل عبارت نقل کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ کتاب بعد کی بھی ہے۔ متقدمین کے اقوال اور رد و قدح سے فائدہ اٹھانے کے بعد لکھی گئی ہے اور دار المصنفین کی خصوصیت "یعنی

تاریخ کے بجس میں سیاناین کے ساتھ مناظرہ" کی حامل بھی ہے اور جہاں تک صحابہ پرستی کے بے امتیاز پروپگنڈہ نے اثر جمایا ہے، اس کتاب میں وہ بھی ٹوٹا ہے، اس طرح اس کا قول صحابہ پرست حضرات کے لئے بہت زیادہ قابل اعتبار ہے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود حسب رفق رسابق کسی طرح اس مسئلہ کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے اور نہ ان غیر مستحکم بنیادوں پر قائم شدہ عمارت کو محکم دکھانے میں کوئی شخص کامیاب ہو سکتا ہے، جن پر یہ صحابہ پرست گروہ مصر ہے "ولن یصلح العطار ما افسد الدھر" یعنی ایک طرف صحابی کی تعریف تو وہ مسلم مانی گئی کہ جس مسلمان نے آنحضرتؐ کو دیکھ لیا، دوسری طرف "الصحابۃ کلھم عدول" کا عقیدہ بھی لازم، تیسری طرف سب واجب التعظیم استثنا کوئی نہیں، چوتھی طرف یہ کہ معصوم کوئی نہیں، پانچویں طرف یہ کہ قرآن وحدیث، عقل وروایت سب کا اعلان کہ فضیلت کا دارومدار صرف علم وعمل" پر، چھٹی طرف یہ کہ حدود خدا سے تجاوز کرنے والوں کی دوستی حرام ہونا نص قرآن موجود، ساتویں طرف تواریخ احادیث واقعات بلکہ قرآن مجید میں تصریح موجود کہ صحابہ میں فاسق، فاجر، منافق، مرتدین سب ہی موجود تھے۔

بہر حال کتاب "اسوۂ صحابہ" حصہ اول مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ کی عبارت صفحہ ایک سے صفحہ ۱ تک درج ذیل کی جاتی ہے۔

صحابہ

جو پاک ہستیاں عہد رسالت میں تھیں ان میں بہت سے بزرگ تھے جنہوں نے مدتوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا بہت سے بزرگ تھے جنہوں نے آپ کے ساتھ متعدد غزوات میں شرکت کی تھی، بہت سے بزرگ تھے جنہوں نے آپ سے احادیث کی روایتیں کی تھیں، بہت سے بزرگ تھے جنہوں نے مسلمان ہو کر سن بلوغ میں آپ کو دیکھا تھا بہت سے لوگ تھے جنہوں نے آپ کو قبل اسلام دیکھا تھا اور بعد اسلام ان کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔ بہت سے لوگ تھے جو عہد رسالت میں موجود تھے لیکن ان کو آپ سے ملنے یا آپ کے دیکھنے کا موقع نہیں ملا، بہت سے لوگ تھے جنہوں نے آپ کی زندگی میں آپ کو نہیں دیکھا تھا لیکن آپ کی وفات کے بعد ایسے لوگوں کو بہت سے کہنا مشکل ہے ان کو آپ کا دیدار نصیب ہوا اور ان کے علاوہ بہت سے بچے تھے جو آپ کے مبارک عہد میں پیدا ہوئے اور صحابہ کرام نے ان کو اکثر آپ کی خدمت میں حاضر کیا آپ نے ان کا نام رکھا، ان کی تحنیک کی اور ان کو دعا دی۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف الحیثیات بزرگوں میں کون لوگ ہیں جن پر لفظ صحابی کا اطلاق کیا جا سکتا ہے اور وہ صحابہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس خطاب سے یاد کئے جا سکتے ہیں:

(۱) محدثین کی ایک جماعت اور جمہور اصولیین نے صحابی ہونے کے لئے یہ شرط لگائی ہے کہ اس کو ایک مدت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ

نشست و برخاست کا موقع ملا ہو، اس بناء پر ان کے نزدیک ان کے علاوہ جو لوگ ہیں ان کو صحابی نہیں کہا جا سکتا، ان کا استدلال یہ ہے کہ عرف عام میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص فلاں کا ساتھی یا رفیق یا صاحب ہے تو اس سے صرف یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے ایک کافی زمانہ تک اس کی صحبت اٹھائی ہے جو لوگ کسی شخص کو صرف دور یا قریب سے دیکھ لیتے ہیں اور اس کو ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملتا، ان کو عام طور پر اس کا رفیق یا صاحب نہیں کہا جاتا۔

قاضی ابوبکر محمد بن لطیف کا قول ہے کہ باتفاق اہل لغت صحابی صحبت سے مشتق ہے مگر صحبت کی کسی مخصوص مقدار سے مشتق نہیں بلکہ اس کا اطلاق ہر اس شخص پر ہو سکتا ہے جس نے کم یا زیادہ کسی کی صحبت اٹھائی اس لئے کہا جاتا ہے کہ میں نے ایک سال یا ایک مہینہ یا ایک دن یا ایک گھڑی تک ایک شخص کی صحبت اٹھائی اس سے صحبت کی تھوڑی یا زیادہ مقدار دونوں پر صحبت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ عرفاً صحابی صرف اس شخص کو کہہ سکتے ہیں جس نے کسی کی طویل صحبت اٹھائی ہو۔ عرفاً اس شخص کو صحابی نہیں کہہ سکتے جس نے کسی سے ایک گھنٹہ کی ملاقات کی ہو یا اس کے ساتھ چند قدم چلا ہو یا اس سے کوئی حدیث سنی ہو۔

(۲) حضرت سعید بن مسیب نے اس شرط کے ساتھ یہ قید بھی لگائی ہے کہ کم از کم اس کو رسولؐ کے ساتھ دو ایک غزوات میں بھی شرکت کا موقع ملا ہو اور کم از کم اس نے ایک سال آپ کے ساتھ قیام کیا ہو۔

(۳) بعض لوگوں کے نزدیک صحابی صرف اس کو کہتے ہیں جس نے رسول اللہ صلعم سے احادیث کی روایت کی ہو۔

(۴) بعض لوگوں کے نزدیک صحابی ہونے کے لئے صرف طول صحبت کافی نہیں

ہو سکتا جبکہ اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس نے آپ کی صحبت بغرض حصول علم و عمل اختیار کی ہے، چنانچہ علامہ سخاوی فتح المغیث میں لکھتے ہیں:

"قال ابو الحسن فی المعتمد هو من طالت مجالسته له علی طریق التبع له والاخذ عنه اما من طالت بدون قصد الاتباع او لم تطل کالوافدین فلا"

"ابوالحسن نے معتمد میں کہا ہے کہ صحابی وہ ہے جس نے بطریق اتباع آپ کی طویل صحبت اٹھائی ہو اور آپ سے علم حاصل کیا ہو جن لوگوں نے اس کے بغیر آپ کی طویل یا غیر طویل صحبت اٹھائی (مثلاً وفود میں آنے والے لوگ) وہ صحابی نہیں ہیں"۔

(۵) بعض لوگ ہر اس مسلمان کو صحابی کہتے ہیں جس نے حالت بلوغ میں اور حالت صحت عقل میں آپ کو دیکھا ہے۔

(۶) بعض لوگوں کے نزدیک آپ کا دیکھنا بھی ضروری نہیں بلکہ ہر اس مسلمان کو صحابی کہا جا سکتا ہے جو عہد رسالت میں موجود تھا چنانچہ قاضی عبد البر نے اپنی کتاب استیعاب میں اور ابن منده نے اپنی کتاب معرفۃ الصحابہ میں اسی شرط کی بنا پر بہت سے ان لوگوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو آپ کے عہد میں موجود تھے لیکن انہوں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا لیکن درحقیقت یہ لوگ صحابی نہیں تھے بلکہ اس سے یہ مقصود تھا کہ اس زمانہ کے تمام موجودوں کے حالات کا استقصا کر لیا جائے۔

(۷) محدثین کی ایک جماعت جس میں امام احمد علی بن مدینی اور امام بخاری بھی شامل ہیں صحابی کا خطاب صرف ان لوگوں کو دیتے ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حالت اسلام میں دیکھا ہے بلکہ آنکھوں سے

دیکھنا بھی ضروری نہیں صرف آپ کی ملاقات کافی ہے مثلاً حضرت عبد اللہ بن مکتوم اندھے تھے اس لئے آپ کو آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن بایں ہمہ ان کا شمار صحابہ میں ہے کیونکہ ان کو آپ کا شرف ملاقات حاصل تھا۔

ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ لغت کی رو سے ہر اس شخص کو صحابی کہہ سکتے ہیں جس نے زمانہ کی کسی ساعت میں ایک شخص کی صحبت اٹھائی ہے، امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ ہر اس شخص نے جس نے ایک مہینہ یا ایک دن یا ایک منٹ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اٹھائی ہے یا آپ کو صرف دیکھا ہے وہ صحابی ہے، امام بخاری فرماتے ہیں کہ جس مسلمان نے آپ کی صحبت اٹھائی یا آپ کو دیکھا وہ صحابی ہے۔

ان تمام اقوال سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ آپ کے عہد مبارک میں پیدا ہو کر سن بلوغ کو نہیں پہنچے وہ صحابی نہیں ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اصابہ میں لکھتے ہیں

"ذکر اولئک فی الصحابه انما هو علی سبیل الالحاق لغلبة الظن علی انه صلی الله علیه وسلم رآهم"۔

"صحابہ میں ان لوگوں کا ذکر الحاق ہے کیونکہ ظن غالب یہی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دیکھا ہے"۔

لیکن بعض لوگوں کے نزدیک یہ لوگ بھی صحابہ کے گروہ میں داخل ہیں چنانچہ مولانا عبدالحی صاحب ظفر الامانی میں لکھتے ہیں:

"والمرجح هو دخوله فیهم نعم حدیثهم مرسل لکنه مرسل مقبول"

"مرجح یہ ہے کہ وہ صحابہ میں داخل ہیں البتہ ان کی حدیث مرسل

ہے لیکن وہ مرسل بھی مقبول ہے"۔

اسی طرح جن لوگوں نے وفات کے بعد آپ کو دیکھا وہ بھی صحابہ کی جماعت میں داخل نہیں چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی مقدمہ اصابہ میں لکھتے ہیں، والراجح عدم الدخول (قول راجح یہ ہے کہ یہ لوگ صحابی نہیں ہیں) جو مسلمان آپ کے زمانہ میں موجود تھے، لیکن ان کو آپ کا دیدار نصیب نہیں ہوا وہ بھی صحابی نہیں ہیں چنانچہ حضرت اویس قرنی اسی قسم کے بزرگ ہیں، جن لوگوں نے اسلام لانے سے پہلے آپ کو دیکھا تھا لیکن اسلام کے بعد ان کو آپ کی زیارت حاصل نہیں ہوئی وہ بھی صحابی نہیں ہیں بلکہ ان کا شمار کبار تابعین میں ہے، اس لئے حسب اقوال مختلفہ صرف ان لوگوں کو صحابی کہا جا سکتا ہے:

(۱) جنہوں نے ایک مدت تک آپ کی صحبت کا شرف حاصل کیا ہے۔

(۲) یا کم از کم ایک غزوہ میں شرکت کی ہے۔

(۳) یا آپ سے احادیث کی روایت کی ہے۔

(۴) یا آپ کی صحبت بغرض استفادہ علم اختیار کی ہے۔

(۵) یا مسلمان ہونے کے ساتھ آپ کو حالت بلوغ و حالت ثبات عقل میں دیکھا ہے یا آپ سے ملاقات کی ہے۔

(۶) یا صرف حالت اسلام میں آپ کو دیکھا ہے یا ملاقات کی ہے۔

ان اقوال میں چھٹا یعنی آخری قول جمہور کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح اور عام مسلمانوں میں مقبول ہے کیونکہ یہ ان تمام صحابہ کو شامل ہے جن سے احادیث کی روایت کی جا سکتی ہے اور ان کو اسوۂ حسنہ بتایا جا سکتا ہے، اس کے بعد پہلا یعنی اصولین کا قول قابل اعتبار ہے کیونکہ اس سے اگرچہ بہت سے وہ صحابہ جنہوں نے صرف رسول اللہ صلعم کو دیکھا تھا لیکن آپ کی فیض صحبت سے کافی زمانہ تک متمتع نہیں ہوئے تھے، صحابہ کی جماعت سے نکل جاتے ہیں تاہم اس کے ذریعہ سے صحابیت کا ایک بلند

معیار قائم ہوتا ہے اور تمام اکابر صحابہ اس میں شامل ہو جاتے ہیں، ان کے علاوہ اور تمام اقوال درجہ اعتبار سے گرے ہوئے ہیں کیونکہ ان میں بعض اس قدر وسیع اور عام ہیں کہ عہد رسالت کا ہر مسلمان صحابہ کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے اور بعض اس قدر محدود ہیں کہ بہت سے اجلہ صحابہ بھی صحابہ کے گروہ سے نکل جاتے ہیں، اس کے علاوہ فضیلت کا دارومدار صرف علم و عمل پر ہے۔ اصولیین نے صحابہ کی جماعت پر اخذ مسائل اور روایت حدیث کے لحاظ سے نظر ڈالی اس لئے انہوں نے صرف اس شخص کو صحابی قرار دیا جس نے مدت تک آنحضرت صلعم کا شرف صحبت حاصل کیا لیکن جمہور کے نزدیک صرف زہد و تقدس صحابیت کا معیار رہا اس لئے وہ ہر اس شخص کو صحابی کہتے ہیں جس نے حالت اسلام میں آپ کو دیکھا ہے یا آپ کی ملاقات کی ہے۔ انتہیٰ

قبل اس کے کہ اس عبارت کے متعلق کوئی رائے ظاہر کی جائے اسی کتاب کے چار یا پانچ صفحے بعد کی عبارت ذیل بھی نقل کر دی جائے تا کہ صحابہ کے متعلق بہت سے سوالوں کے حل کرنے میں سہولت پیدا ہو جائے۔

(ملاحظہ ہو صفحہ ۱۱ سطر ۱۵)

عدالت صحابہ

اگرچہ اصول کا یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ **الصحابۃ کلھم عدول** یعنی تمام صحابہ عادل ہیں لیکن شافعیہ میں ابوالحسین بن القطان نے اس عموم سے اختلاف کیا ہے کیونکہ ان کے نزدیک صحابہ میں چند بزرگ ایسے بھی گزرے ہیں جن سے کچھ لغزشیں سرزد ہوئی ہیں۔ وحشی صحابی تھے لیکن انہوں نے اسلام سے پہلے حضرت حمزہ سید الشہداء کو قتل کیا ہے۔ ولید صحابی تھے لیکن انہوں نے شراب نوشی کیا ہے۔ حاطب بن عتبہ صحابی تھے لیکن انہوں نے رسول اللہ صلعم کے منشا کے خلاف کفار مکہ کو خط لکھا ہے، خوارج کا خیال ہے کہ عام طور پر تمام صحابی خانہ جنگی کے زمانے سے پہلے عادل تھے لیکن جب خود صحابہ میں خانہ جنگی پھیل گئی اور صفین اور جمل کے معرکے بپا ہوئے کارزار گرم ہوئے تو یہ عادل باقی نہ رہے معتزلہ کے نزدیک جن لوگوں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جنگ کی وہ عادل نہیں جو لوگ حضرت امیر معاویہ کے طرفدار ہیں وہ اس کے برعکس دعوے کرتے ہیں۔ محدث مازری نے اس اصول کو صرف ان صحابہ کے لئے مخصوص کیا ہے جو شب و روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اور آپ کی اعانت میں مصروف رہتے تھے ان کے نزدیک عام صحابہ اس عموم میں داخل نہیں چنانچہ ان کا قول ہے۔

"لسنا نعنی بقولنا الصحابۃ عدول کل من رآہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یوما ما اوزارہ لماما او اجتمع بہ لغرض وانصرف عن کثب و انما نعنی بہ اللذین لازموہ و عزروہ

واتبعوا النور الذی انزل معه اولئک هم المفلحون"

ہم جو یہ کہتے ہیں کہ کل صحابہ عدول ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر وہ شخص جس نے آپ کو کسی دن دیکھ لیا یا چلتے پھرتے آپ کی زیارت کر لی یا کسی غرض سے آپ کی ملاقات کر کے تھوڑی دیر کے بعد واپس گیا عادل ہے بلکہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے آپ کی تائید و اعانت کی اور اس نور کا اتباع کیا جو آپ کے ساتھ اتارا گیا، یہی لوگ ہیں جو کامیاب ہیں لیکن عام محدثین کے نزدیک ان آیات کی بنا پر جو قرآن مجید میں عموماً تمام صحابہ کے فضائل میں نازل ہوئی ہیں یہ اصول تمام صحابہ پر ہر زمانہ میں حاوی ہے اور اس کے تحت میں صحابہ کا ہر فرد داخل ہے۔ جو لوگ اس اصول کی ہمہ گیری کے مخالف ہیں انہوں نے عدالت کے مفہوم پر غور نہیں کیا ہے عدالت ایک مشترک لفظ ہے جس کے مختلف معنی ہیں۔

(۱) کبھی عدالت کو جور و ظلم کے مقابل میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس وقت یہ لفظ انصاف کا مترادف ہو جاتا ہے۔

(۲) کبھی فسق و عصیان کے مقابل میں استعمال کیا جاتا ہے اور اس وقت یہ لفظ تقویٰ کا ہم معنی ہو جاتا ہے۔

(۳) کبھی یہ لفظ عصمت پر دلالت کرتا ہے اور یہ وصف انبیاء اور ملائکہ کے ساتھ مخصوص ہے۔

(۴) کبھی عدالت کا لفظ **حفظ عن الخطا والذنب** پر دلالت کرتا ہے نتائج کے لحاظ سے اگرچہ یہ وصف عصمت کا مرادف ہے تاہم دونوں میں یہ فرق ہے کہ عصمت ایک ملکہ فطری و وہبی ہے اور **حفظ عن الخطا والذنب** ایک ملکہ کسبی ہے اسی بناء پر انبیاء کو معصوم اور اولیاء کو محفوظ کہا جاتا ہے۔

(۵) کبھی عدالت کے معنی **اجتناب عن الکذب** کے ہوتے ہیں یعنی اس معنی میں عادل اس شخص کو کہتے ہیں جو روایات میں دروغ بیانی نہ کرتا ہو۔

تمام صحابہ کو اسی آخری معنی میں عدول کہا جاتا ہے، یہ کسی محدث کا دعویٰ نہیں ہے کہ صحابہ کوئی بات انصاف کے خلاف نہیں کر سکتے ان سے کوئی فعل تقویٰ و طہارت کے خلاف صادر نہیں ہو سکتا۔ وہ انبیاء کی طرح معصوم ہیں یا وہ تمام گناہوں سے محفوظ ہیں۔ چنانچہ محدثین نے صاف صاف یہ تصریح کی ہے، علامہ سخاوی فتح المغیث میں لکھتے ہیں:

"قال ابن الانباری لیس المراد بعدالتهم ثبوت العصمة لهم واستحالة المعصية منهم وانما المراد قبول رواياتهم من غير تكلف البحث عن اسباب العدالة وطلب التزكية الا ان يثبت ارتكاب قادح ولم يثبت ذالك"

"ابن انباری کا قول ہے کہ ان کی عدالت کے ثبوت کے بعد یہ مطلب نہیں کہ صحابہ معصوم ہیں اور ان سے گناہوں کا سرزد ہونا محال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی روایتوں کو اسباب عدالت و ثقاہت کی چھان بین کے بغیر قبول کر لینا چاہئے، بجز اس صورت کے جب وہ ایسے امر کا ارتکاب کریں جو روایات قادح ہو اور یہ ثابت نہیں ہے۔"

مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی لکھتے ہیں کہ "اہل سنت کا یہ مقررہ عقیدہ ہے کہ صحابہ کل کے کل عادل ہیں یہ لفظ بار بار بولا گیا ہے اور میرے والد مرحوم (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) نے اس لفظ کی حقیقت سے بحث کی تو یہ ثابت ہوا کہ اس موقع پر عدالت کے متداول معنی مراد نہیں ہیں بلکہ صرف **عدالة فی روایة الحدیث** مراد ہے۔

اس کے سوا اور کچھ مراد نہیں ہے اور اس عدالت کی حقیقت روایات میں اجتناب عن الکذب ہے کیونکہ ہم نے تمام صحابہ کی سیرت کو خوب ٹٹولا یہاں تک کہ ان

لوگوں کی سیرت کا تتبع کیا جو خانہ جنگیوں فتنوں اور لڑائی جھگڑوں میں شریک ہوئے تو ہم کو معلوم ہوا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق دروغ بیانی کو سخت ترین گناہ سمجھتے ہیں اور اس سے شدت کے ساتھ احتراز کرتے ہیں'' انتہی

میں نے ابتداء میں عرض کر دیا ہے کہ میرا مقصد اس رسالہ میں صرف اتنا ہے کہ جن اصحاب سے ہم شیعہ محبت رکھتے ہیں اور رکھنا ضروری سمجھتے ہیں ان میں سے کچھ حضرات کے کچھ حالات لکھوں، اس کے مقدمہ میں اتنی لمبی لمبی عبارتوں کا نقل کرنا یا اس قدر تفصیل وتشریح بظاہر اجمال مطلوب کے منافی معلوم ہوتی ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے وقت چونکہ یہ الزام سامنے تھا کہ ''شیعہ اصحاب کو نہیں مانتے'' اور شیعہ اصحاب کو برا کہتے ہیں اور اس گول مول فقرہ کی اشاعت اہلسنت ہی کی طرف سے کی جاتی ہے لہٰذا اہل سنت ہی کے قلم سے اس بات کا دکھا دینا ضروری معلوم ہوا کہ خود اہل سنت صحابہ کے متعلق کیا لکھتے ہیں اور زبانی بیان اور ان کی کتابوں میں لکھے ہوئے بیان میں کہاں تک تطبیق ہے ان کی تحریر کا کیا نتیجہ نکلتا ہے تاکہ دنیا پر پروپگنڈہ کا جو جادو کیا گیا ہے، اس کا پردہ چاک ہو جائے اور صاحبان انصاف سمجھ جائیں کہ شیعہ جو تمام اصحاب کو یکساں نہیں سمجھتے یا سب سے محبت نہیں کرتے یا جن کو برا کہتے ہیں اس باب میں شیعہ بالکل حق بجانب ہیں اور ہرگز کوئی خلاف عقل ونقل نہیں کرتے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ بے شک شیعہ ان غیر مضبوط اصطلاحی اصحاب میں سے سب کو نہیں مانتے بلکہ فقط ان کو مانتے ہیں جن کا ایمان اور عمل صالح ثابت ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ جن کا فسق وظلم ثابت ہے ان سے نفرت و عداوت بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

اصل مسئلہ تو صرف اتنا ہے کہ صحابہ کا اطلاق کن کن لوگوں پر ہوتا ہے، وہ سب یکساں یا یکساں واجب التعظیم ہیں یا ان میں فرق ہے۔ یکساں ہیں تو کس دلیل سے، یکساں نہیں ہیں تو کس دلیل سے لیکن جب توضیح وتشریح کی نوبت آتی ہے تو

صحابہ کے متعلق بہت سے جزئیات کا فیصلہ کرنے کی ضرورت آن پڑتی ہے کیونکہ اس معاملہ میں اکثر گول مول اور اشتباہ پیدا کرنے والے جملے استعمال کیے جاتے اور اصل حقیقت کو روشن نہیں ہونے دیا جاتا ہے ورنہ واقعتاً یہ معاملہ اتنا الجھا ہوا نہیں ہے، جتنا الجھا دیا گیا ہے۔ غور کرنا چاہیے کہ

(۱) اصحاب کے لغوی معنی کیا ہیں؟

(۲) اصحاب رسول کی اصطلاح لغوی معنی میں ہے ’’جس سے جدا‘‘

(۳) یہ اصطلاح کس نے قائم کی ہے

(۴) کیا قرآن وحدیث سے صحابی کی اصطلاح یقینی طور پر معین ہے؟

(۵) پھر یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ جس آیت یا روایت سے بھی صحابی کی اصطلاح متعین کی جائے اس کا مطلب یا وہ روایت متفق علیہ ہے یا اس میں کوئی اختلاف ہے اور پھر شیعہ سنی میں ہے، اس مسئلہ میں اتفاق کیا یا نہیں۔

(۶) قرآن وحدیث میں جب کبھی یہ اصطلاح استعمال کی گئی ہو تو وہ ہمیشہ اچھے کیلئے یا برے کیلئے یا دونوں کے لئے ہے۔

(۷) کیا صحابی اور جس کا صحابی ہو، عقیدتاً یا فقہاً دونوں کا ہم مذہب یا ہم پلہ ہونا لازم ہے؟

(۸) کیا قرآن مجید میں مومن کا صاحب کا فر کو کہا گیا ہے یا نہیں۔

(۹) جب کبھی اصحاب کی لفظ استعمال کی جائے اور کل یا بعض کی تصریح نہ ہو تو اس سے کل سمجھے جائیں گے یا بعض یا کیا؟

(۱۰) اگر صحابی کی تعریف متفق علیہ نہیں ہے تو جب لفظ صحابی یا اصحاب استعمال ہوگی تو کس اصطلاح کی بناء پر ہوگی اور اس سے کون سے صحابی سمجھے جائیں گے۔

(۱۱) اگر صحابی کے کئی معنی ہیں تو ایک ہی وقت میں سب مراد لئے جائیں گے یا

کوئی خاص فرد۔

(۱۲) کیا کل یا بعض اصحاب معصوم تھے اگر تھے تو کوئی اور دلیل کیا ہے۔

(۱۳) کیا کل یا بعض اصحاب محفوظ عن الخطا تھے اگر تھے تو کون اور دلیل کیا ہے۔

(۱۴) کیا اگر کوئی شخص ایک مرتبہ صحابی کی اصطلاح میں داخل ہو جائے تو اس کا ارتداد یا فسق یا ظلم محال ہو جاتا ہے۔

(۱۵) کیا کل یا بعض صحابہ مجتہد تھے یا ان کا مجتہد ہونا عقلاً نقلاً واجب تھا۔

(۱۶) اجتہاد کے کیا معنی ہیں۔

(۱۷) اجتہاد کے شرائط اور ضروریات کیا کیا ہیں۔

(۱۸) جن اصحاب کو اجتہاد کا رتبہ حاصل تھا ان کو کس آیت یا حدیث سے یہ رتبہ حاصل ہوا تھا۔

(۱۹) اجتہاد کی اصطلاح سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں قائم ہوئی یا بعد میں، اگر آپ کے عہد میں قائم ہوئی تو مجتہد صحابہ کے اجتہاد پر آپ نے مہر تصدیق لگائی یا نہیں۔

(۲۰) اجتہاد کب ہوتا ہے آیا نص کے خلاف یا نص کے باوجود اجتہاد جائز ہے

(۲۱) اگر کوئی صحابی نص قرآنی یا حکم سرور کائنات کے خلاف پر عمل کرے تو اس کی جزا کیا ہوگی۔

(۲۲) اگر کسی صحابی کا فسق، ظلم، مخالفت شرع یا نفاق ثابت ہو جائے جب بھی اس کی ذات ملامت و توبیخ سے بالاتر ہی رہے گی۔

(۲۳) اگر دو صحابی کے اقوال و افعال متضاد ہوں تو کون قابل قبول اور کون قابل رد ہوگا

(۲۴) کیا تمام اصحاب کے اعمال و افعال آپس میں متحد تھے

(۲۵) کیا جملہ اصحاب سے محبت اصول دین میں شامل ہے جس کا تارک اسلام سے باہر ہو جاتا ہے

(۲۶) کیا ہر صحابی ایسا ہے کہ اگر اس سے محبت نہ ہو تو نجات ناممکن ہے

(۲۷) کیا کچھ اصحاب ایسے ہیں جن سے محبت نہ ہو تو نجات ناممکن ہے

(۲۸) کیا اگر کوئی صحابی کسی صحابی سے منحرف ہو جائے اس میں اور غیر صحابی صحابی سے منحرف ہو جائے اس میں حکم میں کوئی فرق ہے علی الخصوص جب بنائے انحراف ایک ہی ہو

(۲۹) اگر کوئی ذات ایسی ہو جو صحابی ہونے کے علاوہ کوئی اور شرعی رتبہ بھی رکھتی ہو تو اس کے ساتھ بھی وہی رعایت ہونا چاہئے جو محض صحابہ کے لئے ہے یا کم یا زیادہ اور کیا کوئی ایسی مثال بھی موجود ہے

(۳۰) کیا ہر ہر صحابی کی مدح ضروری ہے اگر کوئی شخص بعض اصحاب سے عمر بھر ناواقف رہے اور کبھی ان کی مدح نہ کرے تو ایسا شخص ناجی نہیں ہو سکتا۔

حق یہ ہے کہ اگر ان سوالوں کا جواب قرآن وحدیث کی روشنی میں دیدیا جائے تو اگر مسلمانوں کے کل اختلاف دور نہ ہوں تو قریب قریب کل تو ضرور ہی ختم ہو جائیں نہیں کسی سے اپنا جواب نہیں چاہتا بلکہ چاہتا ہوں کہ اگر بروز قیامت خدا اور رسول ایسے سوال کریں تو ان کو کیا جواب دیا جائے کم از کم اپنی جگہ پر ہر شخص سے غور کرنے کا خواہشمند ہوں۔ بے شک انصاف اور غیر جانبداری شرط، ہر ضد اور اندھی تقلید نہ دینی پسند کرتی ہے نہ خدا و رسول ہی کے نزدیک قابل مدح ہیں۔

اب ہم ''کتاب اسوۂ صحابہ'' کی عبارت منقولہ بالا کی طرف ناظرین کو توجہ کرنا چاہتے ہیں اور اس میں جو اشتباہات دانستہ یا نادانستہ موجود ہیں ان کی طرف بھی اشارہ کریں گے تا کہ منصف کو فیصلہ میں مدد مل سکے

(اگر عبارت کو طوطوں کی طرح نہ پڑھا جائے بلکہ معانی پر غور بھی کیا جائے تو بہت سے

سوالات خودبخود حل ہو جائیں گے ماننا نہ ماننا اور بات ہے لیکن غیر جانبدار پڑھنے والا نتیجہ پر بہت آسانی سے پہنچ سکتا ہے)۔

(۱)

چھٹا قول صاحب "اسوہ صحابہ" کے نزدیک سب سے زیادہ صحیح ہے یعنی صحابی وہ ہے جس نے صرف حالت اسلام میں آپ کو دیکھا ہے یا ملاقات کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب عام مسلمان صحابی کہیں گے تو ان کی یہی مقبول اصطلاح مراد ہوگی اور جب بھی صحابہ کے متعلق کوئی نزاع ہوگی یا کوئی حکم معلوم کرنا ہوگا تو اسی اصطلاح کا اعتبار سمجھ میں آئے گا۔

صاحب کتاب نے اس قول کے صحیح ہونے کی دلیل بھی دی ہے۔ حیرت ہے کہ اس کو دلیل کس قاعدہ سے کہا جائے فرماتے ہیں: "کیونکہ یہاں تمام صحابہ کو شامل ہے جن سے احادیث کی روایت کی جا سکتی ہے" ابھی تو یہ مرحلہ زیر بحث ہے کہ صحابی کس کو کہیں تاکہ اس سے روایت کرنا صحیح ہو، صحت روایت کے لئے پہلے صحابی ہو لینا ضروری ہے۔ اب غور کیجئے کہ پہلے صحابی کا اطلاق صحیح ہو لیتا ہے تب اس کے لئے حکم صحت روایت عطا دیا جاتا ہے یا پہلے صحت روایت طے ہوتی ہے اس کے بعد اس کو صحابی کے لقب کا استحقاق ہوتا ہے کیا عمدہ طریقہ تعریف ہے صحابی وہ ہے جس سے روایت صحیح ہو جو روایت اس سے صحیح ہوتی ہے جو صحابی ہو اب فیصلہ ناظرین کے حوالہ ہے۔

صاحب کتاب نے اس مقبول جمہور تعریف کے بعد اصولیین کی تعریف کو قابل اعتبار کہا ہے اور باقی کل اقوال کو درجہ اعتبار سے گرا ہوا بتایا ہے اور اصولیین کے قول کے قابل اعتبار ہونے کی دلیل یہ بتائی ہے کہ "اس کے ذریعہ صحابیت کا ایک بلند معیار قائم ہوتا ہے" اور تمام اکابر صحابہ اس میں شامل ہو جاتے ہیں اس میں بھی وہی لطیفہ ہے۔ پہلے سے اکابر صحابہ طے شدہ ہو گئے اب ان کے لئے کوئی ایسی جامع لفظ ڈھونڈھ لی جائے کہ سب اس میں آجائیں گویا صحابی کی تعریف سے پہلے صحابہ کی

تشخیص ہوگئی اور جن جن کو خطاب دینا ہے وہ چن لئے گئے پھر ان کے لئے خطاب تجویز کر کے پھر اس کے ایک معنی مقرر کر دیئے گئے۔ اگر یہ ہوتا کہ صحابہ کی تعریف یہ ہے جو اس معیار پر پورا اترے گا وہ اس لقب سے معزز کیا جائے گا تو قلعی کھل جاتی۔

خلاصہ یہ کہ صحابہ کی تعریف اور اس کے مصداق دونوں ایک دوسرے سے مقدم ہیں گویا لازم آتا تعریف میں کوئی عیب ہی نہیں ہے اب جب اس دلیل کو دیکھتے ہیں کہ صحابہ کے معیار بلند کرنے کی غرض سے اصولیین کی تعریف قابل اعتبار ہے اور ہنسی آتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے مقبول جمہور تعریف کے صحابہ سے اصولیین کے صحابہ میں پستی اور بلندی کا فرق موجود ہے۔ اگر پست اور بلند معیار کے مصداق میں احکام میں فرق کیا جائے تو اصولیین گردن زدنی نہ ہوں اور شیعہ واجب القتل ہو جائیں، یہ کہاں کا انصاف ہے۔

آخر شیعہ بھی تو یہی کہتے ہیں کہ مقبول جمہور تعریف ایسی ہے اس میں بہت سے پست لوگ داخل ہو جاتے ہیں بلکہ اس تعریف میں تو ایسے لوگ بھی آجاتے ہیں جو بحکم خدا و رسول تعظیم کیسی بلکہ تحقیر کے حقدار ہیں۔ دوسرے اقوال کے پایہ اعتبار سے ساقط ہونے کی دلیل بھی قابل توجہ ہے چونکہ بعض اس قدر وسیع ہیں کہ اس میں عہد رسالت کا ہر مسلمان صحابہ کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے۔ فرد سے اگر ایسا ہو بھی جائے تو مقبول جمہور تعریف کے مصداق سے کیا ایسا عظیم الشان تفرقہ پڑ جاتا ہے جو دین یا دنیا میں آفت ڈھا دیتا ہے۔ داخل ہو جاتے ہیں ہو جائیں قرآن یا حدیث کس نے سب کو داخل ہونے سے روکا ہے یا کس دلیل عقل نے اس کو منع کیا ہے۔ اگر کسی کو ایک خطاب مل رہا ہے جو اس سے بدرجہا پست لوگوں کو بھی مل چکا ہے تو اس غریب کے لئے جناب کیوں بخل فرماتے ہیں۔

سبحان اللہ اویس قرنی کو صحابی کہتے ہوئے تو آپ کی زبان رکتی ہے اور ولید، عمرو عاص، مروان، عبداللہ بن ابی سرح کو صحابیت کا خلعت عطا فرماتے ہوئے ذری جھجک نہیں ہوتی اور غریب اویس باوجود علماً وعملاً ان سب سے بدرجہا بہتر ہونے کے

ان سب سے علی الاطلاق کمتر سمجھے جائیں، کیا خوب منطق ہے۔ میں ان باتوں پر تبصرہ نہ کرتا کیونکہ مجھے تو اہل سنت کے نزدیک مانی ہوئی تعریف صحابہ پر نتیجہ متفرع کرنا ہے مگر صرف اس لئے تبصرہ کر دیا ہے کہ اندازہ ہو جائے کہ صحابہ کے باب میں بھی ان حضرات کے یہاں کتنا اضطراب ہے اور اصحاب کے معاملے میں آکر منطق کو کتنی آسانی سے بھلایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ احکام و نتائج مترتب کرتے ہیں بجز اضطراب و انتشار اور تضاد بیانی کے اور کس بات کی توقع ہو سکتی ہے۔

اب ذرا آگے بڑھئے لطیفہ زیادہ پر لطف ہو جاتا ہے وہ یہ کہ ایک ایسے صحابہ پرست کے قلم سے صحابہ کی تعریف و تاریخ لکھتے وقت یہ الفاظ بھی نکل جاتے ہیں کہ ''فضیلت کا دارومدار صرف علم و عمل پر ہے'' کاش اس دارومدار کو صرف خوبی تحریر کے لئے نہیں بلکہ واقعی اور عملی و اعتقادی حیثیت سے ملحوظ رکھا گیا ہوتا تو صحابہ کی مدح و قدح کا معاملہ بالکل افسانہ بن کر رہ جاتا۔ اس لئے کہ جو شخص اس معیار پر پورا اترتا سب کے نزدیک ممدوح ہی ہوتا اور جو اس معیار پر پورا نہ اترتا اسے فضیلت کی پگڑی نہ باندھی جاتی۔

بہرحال صاحب کتاب نے جن دو قولوں کو صحیح اور قابل اعتبار رہنا ہے ان کی تائید میں یہ دلیل ارشاد فرماتے ہیں کہ ''فضیلت کا دارومدار علم و عمل پر ہے اس لئے (اصولیین نے) صرف اس شخص کو صحابی قرار دیا جس نے مدت تک آنحضرت کا شرف صحبت حاصل کیا۔

لیکن جمہور کے نزدیک صرف زہد و تقدس صحابیت کا معیار ہے اس لئے وہ ہر اس شخص کو صحابی کہتے ہیں جس نے حالت اسلام میں آپ کو دیکھا ہے یا آپ سے ملاقات کی ہے۔''

کون پوچھے کہ جناب والا علم و عمل اور زہد و تقدس ان دونوں میں تباین کی نسبت کب سے پیدا ہو گئی، کیا علم و عمل کے علاوہ کوئی شئی زہد و تقدس ہے یا ہو سکتی ہے یا

زہد و تقدس بغیر علم و عمل کسی طرح ممکن یا کسی جگہ اس کا وجود ہو سکتا ہے تا کہ علم و عمل کا لحاظ کرنے والے صحابی کی تعریف میں اس کو ملحوظ رکھ کر ایک ایسی تعریف کریں جس پر شمار میں علیحدہ نمبر لگایا جائے۔

کون پوچھے کہ جناب والا ''جنہوں نے ایک مدت تک شرف صحبت حاصل کیا۔'' ان کے لئے علم و عمل کی فضیلت حاصل ہو جانے کی سند کیا ہے کیا بقول آپ کے جن لوگوں نے مدت تک شرف صحبت حاصل کیا ان کا علمی افلاس بہت زیادہ مشہور نہیں ہے۔ الفاظ قرآن کے معنی نہ جاننا، میراث کے احکام نہ جاننا، حدود و رجم کے مستحقین کا علم نہ ہونا مرتے دم تک یہ کہتے جانا کہ کاش رسول اللہؐ سے یہ معلوم کر لیتے وغیرہ۔ علمی افلاس کے لئے یہ کافی نہیں کہ بھرے مجمع میں ایک عورت ٹوکے اور اس کا جواب نہ بن پڑے مدت تک صحبت کا شرف حاصل کرنے والوں کے اعمال کا نقص کیا اس سے واضح نہیں ہوتا کہ تیمم کرنا تک نہ آیا ہو۔ ازیں قبیل حالات کے رہتے ہوئے مدت تک شرف صحبت سے علم و عمل کی فضیلت کہاں سے حاصل ہو جائے گی۔ کیا مدت تک شرف صحبت حاصل کرنے والے مرتد نہیں ہوئے۔ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق کیا خیال ہے اور بخلاف مرضی رسول اس کو بحالت ارتداد پناہ دینے والے کا کیا حکم ہے۔

کون پوچھے کہ کیا صرف اخذ مسائل اور روایت حدیث کسی کے عالم باعمل ہونے کی سند ہو سکتی ہے۔ ورنہ تو علم ہی ہونا مشکل ہے اس لئے کہ اس کے لئے تعقل، تفکر اور عقل و ذہن کی ضرورت ہے۔ ''رب حامل فقه غیر فقیه''

(مشکوٰۃ ص۳۵، کتاب العلم)

اور اگر روایت سے علم لازم مان بھی لیا جائے تو عمل کا ضروری ہونا کیسے ثابت ہو سکتا ہے۔ کیا عالم بے عمل نہیں ہوتا یہ تو بڑی مشہور بات ہے اور احادیث میں ایسے لوگوں کے وجود کا تذکرہ اور ان کی مذمت کی گئی ہے۔

کون پوچھے کہ جمہور (جن میں بخاری اور ابن حنبل ایسے لوگ بھی شامل ہیں) چونکہ صرف زہد و تقدس کو صحابیت کا معیار قرار دیتے ہیں (غالباً مذکورہ بالا حضرات تو یہ سمجھے ہونگے کہ زہد وتقدس علم کے مطابق عمل کو کہتے ہیں) "اس لئے وہ ہر اس شخص کو صحابی کہتے ہیں جس نے حالت اسلام میں آپ کو دیکھا ہے یا آپ سے ملاقات کی ہے" اس عبارت میں چونکہ اور اس نے میں کیا ربط ہے؟ کیا کسی لغت میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ رویت اور لقاء زہد و تقدس کے مرادف ہیں یا زاہد ومقدس کی رویت اور لقاء زہد و تقدس کے مرادف ہیں۔ کوئی عقلی دلیل اس پر قائم ہو چکی ہے کہ "من راٰہ ولو لحظۃ فھو زاھد مقدس" بلکہ اس کے خلاف تو آپ ہی کے علماء کی تصریح موجود ہے۔ صاحب استیعاب نے صحابہ کی عدالت اور ان کے تذکیہ پر بحث کرتے ہوئے بالکل ابتدائے کتاب میں آیہ "محمد رسول اللہ والذین معہ... الخ" (فتح/۲۹) کو پیش کیا ہے اس کے بعد لکھتے ہیں۔

"فھذہ صفۃ من بادر الی تصدیقہ والایمان بہ و آزرہ و نصرہ و لصق بہ و صحبہ و لیس کذالک جمیع من راٰہ ولا جمیع من آمن بہ"

یعنی یہ صفت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے آپ کی تصدیق میں سبقت کی آپ پر ایمان لانے میں جلدی کی آپ کی تائید اور نصرت کی آپ کے ساتھ چپکے رہے اور آپ کی صحبت میں رہا کئے لیکن جن لوگوں نے آپ کو دیکھا وہ سب ایسے نہ تھے اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے وہ سب بھی ایسے نہ تھے۔

پھر غور فرمایئے کہ صرف مسلمان ہو کر دیکھ لینا زہد و تقدس کے ہم معنی کس طرح ہو گیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس غیر مربوط قول نے اس مسئلہ کو عوام الناس کے سامنے

الجھا رکھا ہے اصحاب کے معنی جس مسلمان نے آنحضرت کی زیارت کر لی اور آنحضرت کی زیارت ولو لحظۃ اس کے معنی زہد وتقدس اور زہد وتقدس کے معنی بھی اس کے خلاف نہیں ہو سکتا اب ظاہر ہے کہ جب یہ وجہ بتا دیا گیا تو تعظیم و محبت خود بخود لازم ہو جائے گی۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ سلسلہ وار اس طرح کے غیر مربوط مقدمات کا اثر صرف انہیں لوگوں پر پڑ سکتا ہے جو عدالت خدا سے توبہ کرنا ضروری جانتے ہیں۔ (ابن خلکان حالات امام ابوالحسن اشعری) جن کے نزدیک حسن وقبح اشیاء کو کسوٹی عقل نہ ہو، جن کے خیال میں تمام نیکوکاروں کو جہنم میں بھیجنا اور بدکاروں کو جنت میں بھیجنا خدا کی ذات کے لئے نازیبا نہ ہو، جن کے یہاں ایک آدمی کے قول کا ماجرا جائز ہو، جن کے یہاں انبیاء کے معصوم ماننے سے آدمی کافر ہو جاتا ہو۔ (دیکھو طبقات ابی البقاء)

جو یہ عقیدہ رکھتے ہوں کہ الامام لا ینعزل بالفسق جو نماز جماعت پڑھانے والے کے بے فاسق ہونے کو مانع نہ سمجھتے ہوں جن کے یہاں تکلیف مالا یطاق رہنا خدا کے لئے زیبا ہو وغیرہ۔

ورنہ جو خدا کو عادل جاننے والا ہو اچھائی برائی کو عقل سے سمجھ سکنے والا ہو جن کے نزدیک بروں کو جنت اور نیکوں کو دوزخ میں بھیجنا خدا کے لیے کسی طرح زیبا نہ ہوتا ماننے والا ہو نص کو اجماع سے نہ ماننے والا ہو، غیر معصوم چاہے ایک چاہے ایک کرور سب سے غلطی کا امکان درست جاننے والا ہو، انبیاء کو اول عمر سے آخر عمر تک گناہان صغیرہ وکبیرہ سے ہر طرح معصوم ماننے والا، امام کے لئے نبی کی طرح عصمت کا قائل ہو۔ جماعت کے امام کے لئے عادل کی شرط کرنے والا ہو۔ اور خدائے حکیم وعادل کی طرف سے تکلیف مالا یطاق کو بالکل ناروا سمجھنے والا ہو۔ وہ ایسی باتوں سے نہ دھوکا کھا سکتا ہے اور نہ ان سے مرعوب ہو سکتا ہے اور نہ اس عقلی اور قرآنی اصول کو چھوڑنے والا ہے کہ ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔ (حجرات/۱۳)

اب چونکہ یہ امر واضح ہوگیا کہ اہلسنت کے نزدیک صحابی میں صرف اسلام اور رویت ضروری ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تو ظاہر ہے کہ ہم شیعوں کا دارومدار ہرگز فقط اتنے پر نہیں ہے۔

نصِ قرآن مجید

"ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات

(سورۂ عصر ۲/)

ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (حجرات ۱۳/)

ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات اولئک ھم خیر البریۃ"

(بینہ ۷/)

اور ان کے علاوہ بکثرت آیات ہیں جنہیں صرف ایمان اور عمل صالح کو نجات اور تعظیم کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ اور ان میں کسی طرح کا کوئی استثنا نہیں ہے بلکہ جو لوگ اس کے خلاف ظالمین فاسقین کافرین کی محبت کریں یا ان کی تعظیم کریں ان کی مذمت بکثرت موجود ہے۔

(ملاحظہ ہو "لا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار")

(ھود ۱۳/)

لہذا معیارِ محبت و تعظیم ایمان و عمل صالح ہے اب دری تعریف تو صحابی اس کو کہتے ہیں۔

"من لقی النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مومنا بہ ومات علی الایمان والاسلام"۔

"جس شخص نے آنحضرت صلعم کی ملاقات بحالت ایمان کی ہو اور اس کی موت بحالت ایمان واسلام واقع ہوئی ہو۔"

یہ ہے صحابی اور یہ سب ایمان قابل قدر و محبت لیکن چونکہ ایمان و عمل صالح کے درجات مختلف ہیں لہذا سب کی محبت و تعظیم میں مساوات پھر بھی نہ ہوگی۔

اور اسی بنا پر تعظیم کے درجات بھی قائم ہوں گے۔ جس کا ایمان و عمل جتنا بلند ہوگا وہ اسی قدر زیادہ بلند تعظیم کا حقدار ہوگا اور جتنا کم ہوتا جائے گا کم ہوتا جائے گا۔

"ولکل درجات مما عملوا" (انعام ۱۳۲/) حکم قرآنی ہے اور مشکوٰۃ درجال کی بے شک اگر ایمان و عمل کے ساتھ شرف زیارت سے بھی آراستہ ہے تو اس کی تعظیم میں ایک سبب کا اور اضافہ ہے اور اگر باوجود روایت کے ایمان و عمل نہیں رکھتا تو ملامت کا زیادہ حقدار ہو گیا۔ اس لیے اصحاب میں امتیاز کی ضرورت ہے کہ صفت ایمان و عمل صالح سے کون آراستہ ہے اور کون نہیں ہے۔

کون "الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم" (انعام ۸۲/) کی فرد ہو۔

کون ہے جس نے "یمنون علیک" (حجرات ۱۷/) کا مصداق اپنے آپ کو ٹھہرایا۔

کون "من یرتد منکم دینہ" (مائدہ ۵۴/) ہوا۔

کون "یحبھم ویحبونہ" (مائدہ ۵۴/) کا مصداق ہوا۔

کون "من نکث فانما ینکث" (فتح ۱۰/) میں آیا۔

کون "من اوفی بعھدہ من اللہ" (توبہ ۱۱۱/) کی فرد رہا۔

مختصر یہ کہ کون اول سے آخر تک واقعی ایماندار رہا اور اسی پر موت واقع ہوئی اور کون دکھاوے والا رہا۔

چونکہ اہلسنت نے صرف رویت پر زور دیا ہے اس لیے اگر چہ وہ سب کچھ سعی کریں، کلام میں ربط اور عقائد میں ضبط نہیں پیدا ہوتا۔ صحابیت میں صرف رویت کے بعد ظاہر ہے کہ اہمیت بہت کم ہوگئی۔ چنانچہ اسی بناء پر عدالت سے مراد بھی ضرور رویت میں جھجکنا نہ ہونا ہے گا۔ چنانچہ "اسوۂ صحابہ" کی دوسری عبارت پر غور فرمائیے۔

عدالت صحابہ

شبہہ اور جواب

عدالت صحابہ کی بحث میں یہ تصریح کر دی ہے کہ "یہ کسی محدث کا دعویٰ نہیں ہے کہ صحابہ کوئی بات انصاف کے خلاف نہیں کر سکتے ان سے کوئی فعل تقویٰ و طہارت کے خلاف صادر نہیں ہو سکتا۔ وہ انبیاء کی طرح معصوم ہیں یا وہ تمام گناہوں سے محفوظ ہیں۔"

اس تصریح کے بعد ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کو ہر نقد و تبصرہ سے بالاتر اور سب کو واجب التعظیم علی الاطلاق یا سب کو عادل کی کسوٹی سمجھیں اور مجمل لفظ کہہ کر دینے کو اشتباہ میں مبتلا کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابیت کا مدار صرف رویت پیغمبر اور حسب تصریح شاہ ولی اللہ صاحب و حسب تسلیم و قبول شاہ عبدالعزیز صاحب و عبدالسلام صاحب جب کل صحابہ کو عادل کہا جائے گا تو اس سے صرف یہ مقصود ہے گا کہ روایت کرتے وقت وہ جھوٹے نہ تھے۔ بس اور بس اگر صحابیت کی مقبول جمہور تعریف اور عدالت صحابہ کی کلیہ کا مطلب ذہن نشین رکھا جائے تو بہت سے امور خود بخود فیصل ہو جاتے ہیں۔ واقعی یہ بات انصاف کی ہے کہ جو شخص اسلام لا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دولت زیارت کر لے وہ ہر طرح کے اوصاف حسنہ سے آراستہ یا صفات مذمومہ سے محفوظ کیونکر ہو جائے اور جب ایسا نہیں ہے تو پھر ایسے شخص کے اقوال و اعمال کو قرآن و حدیث کی روشنی میں جانچ کر اس کے لیے وہی حکم لگایا جائے گا جس کا وہ مستحق ٹھہرے گا۔

صاحب اسوۂ صحابہ اس موقع پر بھی اپنی روایت سے علیحدہ نہیں ہوتے اور سب کچھ لکھنے کے باوجود ولید کو نظر احترام سے دیکھے ہی جا رہے ہیں اور واقعات میں اشتباہ اور اجمال پیدا کرنے سے باز نہیں آتے۔ کس قدر تعجب خیز ہے یہ واقعہ کہ ابوالحسن بن قطان کے نزدیک ولید کی شراب خوری کہہ کر اپنا دامن چھڑانے کی سعی کی گئی ہے اور ولید کے احترام میں باوجود شراب خواری صرف صحابیت کے سبب کمی نہیں آنے دی جاتی اور اسے ہلکا کرنے کے لیے "کچھ لغزشیں" کی لفظیں استعمال کی جاتی ہیں حالانکہ ولید کی شراب خواری صحیح مسلم و بخاری دونوں میں موجود ہے۔ (اصابہ)

اور نہ صرف شراب خواری بلکہ بحالت نشہ نماز صبح بجماعت چار رکعت پڑھنا بھی پوری طرح مشہور ہے اور کتب رجال میں مسطور ہے پھر بھی صاحب "اسوہ" ان الفاظ میں نوٹ فرماتے ہیں

ولید صحابی تھے لیکن انہوں نے شراب نوشی کی ہے۔ ایک طرف تمام صحابہ کا معصوم یا محفوظ یا انصاف ور یا زاہد و متقی ہونا ضروری قرار دیا جاتا ہے دوسری طرف جب ان پر منصوصات قرآنی اور کبائر کا ارتکاب ثابت ہے تب بھی وہ "بزرگ" ہی رہتے ہیں۔ یہ غضب دینی نہیں تو اور کیا ہے لطیفہ تو یہ ہے کہ ولید سابق الاسلام بھی نہیں ہے بلکہ بقولے فتح مکہ کے وقت اسلام لایا۔ اور بقولے فتح مکہ کے روز اس کو اس کے باپ نے سرور کائنات کے پاس پیش فرمایا۔

اہل انصاف سے استدعا ہے کہ مذکورہ بالا تصریحات کے باوجود ولید صاحب کی تعظیم و محبت کا حکم کس منطق کا کام ہے یہ آپ فیصلہ فرمائیں اس سے زیادہ پر لطف احداث شبہہ یہ ہے کہ "وحشی صحابی تھے لیکن انہوں نے اسلام سے پہلے حضرت حمزہ سید الشہداء کو قتل کیا ہے۔" یہ تحریر فرما کر خود گویا ابن قطان کو بڑا بھولا پڑھنے والوں کو بڑا احمق ثابت کرنے کی سعی لاحاصل کی گئی ہے۔ اسلام سے قبل کے واقعات کو صحابیت کی قدح یا مدح میں پیش کرنا کس عقل کا کام ہوتا ہے۔ اور پھر وحشی ہی کا نام کیوں لیا جاتا ہے پھر تو اسلام سے قبل حضرت عمر نے قتل رسول کا ارادہ فرمایا۔ شرک و بت پرستی کی،

حاشیہ

(حضرت عمر کی بہن جب اسلام لائیں اور حضرت عمر کو معلوم ہوا تو اس قدر مارا کہ تمام بدن لہولہان ہو گیا۔لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو کچھ کرنا ہو کر و میں تو اسلام لا چکی۔لبینہ کو بھی حضرت عمر مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ میں نے رحم کی بنا پر نہیں بلکہ اس وجہ سے چھوڑ دیا ہے کہ تھک گیا ہوں اس طرح زنیرہ کو بھی جو ان کے گھرانے کی کنیز تھیں نہایت اذیت دیتے تھے اسلام سے پہلے یہ سب لغزشیں ہوئیں)

یا دیگر کل وہ اصحاب جو اسلام سے قبل کافر ہے یا ارتکاب معاصی کیا سب کی لغزشوں سے استدلال کر کے وحشی کی جنس میں ڈالنا اور معدودے چند مقدودین قرار دینا تھا۔

اصل یہ ہے کہ کبھی تو صحابی بول کر اس کے متعلق دنیا کے دماغ میں یہ ڈالے جاتے ہیں جو معصوم سے بھی اونچے ہو جاتے ہیں اور کبھی صحابی کی حقیقت اتنی رہ جاتی ہے کہ "وہ روایت میں جھوٹ نہیں بولتے تھے۔" فقط اور یہی غلط بحث ہر جگہ اضطراب اور تضاد کا باعث بنتا ہے۔یہ صاف صحابی کی کوئی اسکی حیثیت تسلیم کر لینا چاہیے کہ ان کے جملہ اقوال و افعال ہر نقد و تبصرہ سے بالاتر اور بالکل عصمت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہو جائیں۔یہ پھر غیر معصوم اور مرتکب کبائر کے لیے وہ احکام صادر فرمائے جو قرآن و حدیث میں کھلم کھلا موجود ہیں۔

جب ہم صحابی کی مقبول جمہور تعریف پر نظر ڈالتے ہیں تو صحابی میں کوئی اہمیت پیدا نہیں ہونے پاتی کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ محض رویت سے کسی شخص میں تعلیم و اخلاق سرور کائنات فوراً سرایت نہیں کر سکتے۔اس کے علاوہ کسی کو دیکھنے سے بڑھ کر اس کی باتیں سننا اس کے ساتھ زندگی بسر کرنا بھی اس کے اقوال و اعمال کے اثر انداز ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتے بلکہ صلاحیت شرط ہے نیک نیتی اور ارادہ لازم ہے۔

لطافت طبع رقت قلب اور اثر پذیری ایک نیک سرشت انسان کا اصلی جوہر ہیں،اور انہیں کے ذریعہ سے وہ ہر قسم کی پند و موعظت تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت کو قبول کر سکتا ہے پھولوں کی پنکھڑیاں نسیم صبح کی خاموش حرکت سے ہل جاتی ہیں،لیکن تناور درختوں کو باد صرصر کے جھونکے بھی نہیں ہلا سکتے،شعاع نگاہ آئینہ کے اندر سے گذر جاتی ہے لیکن پہاڑوں میں فولادی تیر بھی نفوذ نہیں کرتے۔بعینہ یہی حال انسان کا بھی ہے ایک لطیف الطبع اور رقیق القلب آدمی ہر دعوت حق کو آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔لیکن سنگدل اور غلیظ القلب لوگوں پر بڑے بڑے معجزے بھی اثر نہیں کرتے۔اس فرق مراتب کی جزئی مثالیں ہر جگہ مل سکتی ہیں۔

لیکن اشاعت اسلام کی تاریخ تمام تر اسی قسم کی مثالوں سے لبریز ہے۔

کتاب اسوہ صحابہ کے یہ الفاظ کسی مزید توضیح و تشریح کے محتاج نہیں۔سرور کائنات کے معجزے،پند و موعظت سب کی تاثیر کے لیے بھی صلاحیت کی شرط لازمی ہے اور ظاہر ہے کہ جن ایک لاکھ چوبیس ہزار یا چودہ ہزار انسانوں نے اسلام کو قبول کر لیا اور آنحضرت کی زیارت سے مشرف ہوئے وہ غلظت قلب لطافت طبع رقت قلب اور اثر پذیری میں بالکل یکساں نہیں تھے۔پھر سب کے لیے ایک حکم، نا ممکن صحیح ہو گا۔کتب رجال میں ایسے بہت نام ملتے ہیں جنہوں نے تھوڑی یا زیادہ مدت صحبت کے بعد اسلام کے اظہار کے بعد کوئی اچھا اثر نہیں لیا۔

اہلسنت نے روایت کی قلت اور کثرت کے اعتبار سے بھی طبقات قائم کیے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی۔اول الذکر سے روایت کی کثرت و قلت کا اندازہ ہو سکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اتنا کہ روایت کے وقت انہوں نے جھوٹ نہیں کہا۔یا یہ کہ ممکن ہے کہ بعض کثیر الروایۃ عام باعمل بھی ہوں لیکن اس میں کلیت اکثریت کا پتہ نہیں اس لیے اسکو معیار فضل علی الاطلاق کہنا درست نہیں ہے۔

تمت

حالاتِ مصنف

از جناب مولانا آغا مہدی صاحب قبلہ مرحوم
(سابق مدیر الواعظ)

ولادت

۲۹ ربیع الاول ۱۳۱۵ھ منگل کے دن اپنے وطن علی نگر پلی، ضلع (جہان آباد) گیا میں پیدا ہوئے اور تاریخی نام "عدیل اختر" رکھا گیا، آپ کا سلسلۂ نسب چھبیس واسطوں سے حضرت امام زین العابدین علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔

ابتدائی تعلیم

ابتدائی تعلیم مدرسہ سلیمانیہ پٹنہ میں مولانا حافظ فرمان علی صاحب مرحوم سے حاصل کر کے مرکزِ علم و عمل لکھنؤ میں آئے، یہ وقت وہ ہے کہ لکھنؤ مئے حال پر بھی اہلِ کمال سے چھلک رہا ہے، فقہ، اصول، منطق و حکمت، ریاضی و فلسفہ، کلام و ادب و معانی و بیان کے ماہر موجود ہیں اور شہر کے ہر گوشہ میں درس و تدریس کا چرچا ہے۔ مشارع الشرائع مدرسہ ناظمیہ میں مدارج عالیہ کی تکمیل فرمائی اور ممتاز الافاضل کی سند امتیاز خاص کے ساتھ حاصل کی۔ ممتاز الافاضل ہونے سے پہلے آپ الہ آباد یونیورسٹی کے اعلیٰ اسناد بھی حاصل کر چکے تھے، ناظمیہ مدرسہ میں درجہ فاضل کو ایک مدت تک

آپ نے درس دیا اور سرکار نجم العلماء نے اس حسن خدمت کے صلہ میں جو سند عطا کی اسے مولانا نے اپنے لئے تاج عزت قرار دے کر تمام سرکاری اور غیر سرکاری اسناد میں معزز سمجھا۔

۱۹۱۹ء میں مدرسۃ الواعظین قائم ہوا۔ آپ پہلے طالب علم ہیں جنہوں نے امتحان کے ساتھ مقاصد مدرسہ کو کامیاب بنایا۔ تین سال کی جدوجہد کے بعد ۱۹۲۱ء میں آپ اپنی جماعت میں سب سے اعلیٰ درجہ میں کامیاب ہو کر مدرسہ کی تعلیم سے فارغ ہوئے اور صوبہ بہار و بنگال آپ کا مرکز تبلیغ قرار پایا جہاں کبھی آپ کا تقرر منجانب مدرسہ قرار پایا وہاں کی مقامی زبان حاصل فرمائی، چنانچہ بنگال میں بنگلہ زبان حاصل کی۔ کچھ مدت کے بعد یوپی کے مغربی اضلاع میں شدھی کا زور و شور ہوا۔ اس نازک فضا میں جس حسن و خوبی سے آپ نے مدرسہ کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں خدمات انجام دیں وہ آپ کے مخصوص کارناموں میں ہیں۔

۱۹۲۳ء میں آپ کو مدرسہ نے جزائر افریقہ میں فریضہ تبلیغ پر مامور کیا۔ قدیم ہندوستان کا صوبہ سرحد آپ کی واپسی کا بکمال شوق منتظر تھا۔ افریقہ سے واپسی کے بعد ہی باشندگان صوبہ سرحد کی دعوت پر مدرسہ نے مولانا کا مرکز تبلیغ پشاور مقرر کیا۔ یہاں کے زمانہ قیام میں مدرسہ نے کچھ مدت کے لئے تبت کے دور افتادہ علاقہ میں آپ کو مامور کیا اور آپ وہاں گئے اور باشندگان تبت کو اپنی مذہبی خدمات سے جس طرح مطمئن فرمایا وہ ایک مفید اور دلچسپ تبلیغی شاہکار ہے۔ جس کی روداد رسالہ الواعظ کے صفحات میں موجود ہے۔ فرقہ نوربخشیہ کے خیالات کو صحیح مرکز پر قائم کرنا اور وہاں جماعت کے غلط اصول کو شکست دینا آپ کے تجربہ اور تدبر کی بہترین مثال ہے۔

یہاں سے واپسی کے بعد آپ اپنے مرکز تبلیغ صوبہ سرحد تشریف لائے اور ۱۹۲۶ سے ۱۹۳۶ تک کا زمانہ آپ نے اس ناہموار زمین کے ہموار کرنے میں صرف فرمایا۔ جون ۱۹۳۶ میں آپ کا تقرر بحیثیت وائس پرنسپل مدرسۃ الواعظین ہوا۔ اہل

پشاور مولانا کے لکھنؤ آنے پر کسی طرح رضامند نہ تھے مگر حضرت نجم العلماء کے فرمان سے سپر انداختہ ہو کر رخصت کیا۔

آپ نے درس و تدریس کے نظام میں جدید اصلاحات پیش کیے اور اپنے تجربات کی بناء پر نصاب تعلیم تبدیل کر کے لباس نو پہنایا اس عہدہ پر خدمت کو ایک ہی سال ہوا تھا کہ پرنسپل صاحب نے انتقال فرمایا اور ارباب حل و عقد نے آپ کے خدمات کی قدر دانی فرما کر پرنسپل کے عہدہ پر مقرر کیا۔ مولانا کا انتخاب عہدہ پرنسپل پر ہونے کا اعلان ہوتے ہی پراونشل شیعہ کانفرنس صوبہ سرحد انجمن امامیہ بنگش استرزئی صوبہ کوہاٹ اور دیگر اداروں نے مدرسہ کو اپنے بیانات تبریک سے مطلع کیا۔ جو الواعظ یکم جولائی ۱۹۳۷ء میں موجود ہیں

۱۹۳۶ء سے تا انتقال آپ حضرات واعظین کی تعلیم و تربیت فرماتے رہے۔ آپ کے صفات پر مختصر روشنی ڈالنے کے لئے اخبار سرفراز مورخہ ۲۱ فروری ۳۷ء کے ایک طویل مضمون کا ایک حصہ درج ذیل ہے:

”آپ سب سے پہلے طالب علم ہیں جنہوں نے مدرسہ میں جماعت میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کئے اور آج تک مدرسہ کی تحریری و تقریری خدمت انجام دیتے رہے، اخبار کا مطالعہ کرنے والے اور مدرسۃ الواعظین کے تبلیغی خدمات سے دلچسپی رکھنے والے اس سے بخوبی واقف ہیں کہ موصوف نے ہندوستان کے علاوہ افریقہ اور تبت میں بھی تبلیغی خدمات انجام دی ہیں، موصوف اُردو فارسی و عربی کے ماہر ہونے کے علاوہ انگریزی، گجراتی، پشتو، پنجابی اور سواحلی زبانوں میں بھی بقدر ضرورت تحریر و تقریر فرما سکتے ہیں، موصوف نے مذاہب غیر کا غیر معمولی مطالعہ کیا ہے اور اس کے متعلق مفید و دلچسپ مضامین بھی شائع کرتے رہے ہیں۔ آپ ہندی میں بھی واقفیت رکھتے ہیں اور بآسانی لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ فی زمانہ جو

طرز تبلیغ اقوام عالم کا ہے آپ اس سے بھی باخبر ہیں۔“

ظاہر داری اور نام و نمود سے آپ کو قطعی نفرت تھی، وسعت مطالعہ کا حال مدرسۃ الواعظین کے عظیم الشان کتب خانہ کی سیر سے دریافت ہو سکتا ہے۔ بکثرت وہ کتابیں ہیں جن پر عربی میں حواشی موجود ہیں۔ یہ علمی نوٹس جب تک کتب خانہ قائم ہے مرحوم کے باقیات الصالحات میں ہیں، ممدوح نے اپنی عمر میں جتنی قومی تحریکیں ہوئیں اُن کو کامیاب بنایا۔ محاذ حسینی اور تبرا ایجی ٹیشن میں آپ ہی کے قلم کی گردش کا اثر تھا جو اسیری کے لئے پشاور اور پنجاب اُمنڈ آیا۔ وہ منظر عام پر آنے کے عادی نہ تھے، جس مقصد کو صحیح سمجھتے تھے، اس کو مدد بہونچانے میں بلا تحریک مصروف ہو جاتے تھے۔ عشرہ اور چہلم کے دن اگر لکھنؤ میں قیام ہوا تو صرف ایک کالا کرتا پہن کر اور سر و پا برہنہ کربلا تشریف لے جاتے تھے، مشاہد مقدسہ کی زیارت سے بھی خداوند عالم نے دوبارہ ۱۹۲۵ اور ۹۲۹ء میں مشرف کیا اور آپ کو علامہ بروجردی مدظلہ کی وکالت کا بھی اعزاز حاصل تھا۔

انتقال سے دو سال پہلے زیارت حرمین کا بھی شرف حاصل ہوا اور حج بیت اللہ کی زیارت ہوائی جہاز سے کی۔ اس سفر کے دلچسپ اور تاریخی حالات استقلال، لکھنؤ کی متعدد اشاعتوں میں طبع ہو چکے ہیں جو آپ کی تالیف کی حیثیت ہے۔

تقاریر

دنیائے شیعیت کا چپہ چپہ آپ کے مواعظ اور تقریروں سے واقف ہے، لکھنؤ، کانپور، الہ آباد، آگرہ، فیض آباد، اعظم گڑھ، بنارس، مرشد آباد، کلکتہ، رنگون، مراد آباد، مظفر نگر، دہلی، کاٹھیاوار، لاہور، ملتان، راولپنڈی، پشاور، مدراس، ویلور، بنگلور، مسقط، مدغاسکر، زنجبار، کشمیر، جموں اسکردو، لداخ، تبت وغیرہ میں معرکۃ آرا تقریریں فرمائیں، عشرت رحمانی صاحب ریڈیو اسسٹنٹ کے زمانہ میں ماہ محرم اور دیگر مواقع پر آل انڈیا ریڈیو سے بھی آپ کی تقریریں نشر ہوئی ہیں۔

اعزاز ملکی

مولانائے محترم کا چونکہ اس خاندان سے تعلق تھا جس کی مشہور ہستیاں محتاج تعارف نہیں ہیں۔ اس لئے سول وملٹری حکام آپ کی خاص عزت کرتے تھے، اپریل ۱۹۴۷ء میں جب آپ دہلی میں سر سلطان بالقابہ کے مہمان تھے اور دہلی کی اسلامی کانفرنس میں شرکت کیلئے تشریف لے گئے تھے تو مولانا ابوالکلام آزاد نے سابق کے رواسم کی بناء پر آپ کو اپنے یہاں دعوت دی اور اپنے تصانیف مطالعہ کے لئے دیئے۔

ہراکسیلنسی سروجنی نائیڈو گورنر یوپی نے آپ کو کئی مرتبہ گورنمنٹ ہاؤس میں باریاب کیا۔ اور سیاست حاضرہ میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی لیکن اس علم نواز گوشہ نشین نے اپنے حدود عمل سے تجاوز نہ کیا۔ پشاور کے دوران قیام میں سرحد کے گورنر مسٹر کنگھم سے کئی بار ملاقات ہوئی اور اختلاف خیال میں آپ اپنی رائے پر سختی سے قائم رہے اور اتنی خاندانی عزتوں کے باوجود فقیرانہ زندگی بسر کی۔ ناکافی اور قلیل مشاہرہ پر شکر منعم اور فرائض کی ادائیگی میں ولولہ ان کی خاص صفت تھی مال و دولت کی کبھی ہوس نہیں کی اور ایسے ذرائع کے قریب نہیں گئے۔

اخلاق

عام لوگوں کے ساتھ آپ کا خلق و مروت اس قدر قابل ذکر ہے کہ جو ایک مرتبہ آپ سے ملتا تھا اس کے دل میں آپ کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی تھی، غیر شیعہ حضرات کے ساتھ آپ کے خلق ہی کا نتیجہ تھا کہ پشاور اور مضافات پشاور کے اہل سنت بھی اتنی ہی قدر و منزلت سے دیکھتے تھے، جتنا شیعوں میں مقبول تھے۔ اپنے ہمدرس افراد کے ساتھ آپ بہت ہی سادگی اور غیر معمولی عزت کے ساتھ پیش آتے تھے، مدرسہ سلیمانیہ کے ہم سبق طلباء میں نواب زادہ محمد مہدی صاحب، ایم، ایل، سی، نواب علی

سجاد صاحب، علی اکبر صاحب کاظمی اور مدرسہ ناظمیہ کے اہل علم و کمال میں مولانا سید محمد عمید صاحب قبلہ و حافظ کفایت حسین صاحب، مولانا سید خورشید حسن صاحب قبلہ، حضرت قیس زنگی پوری کی خاص عزت کرتے تھے۔

قبول مذہب حق

مولانائے مرحوم کے تبلیغی کارناموں پر نظر کرنے سے وہ اسماء پیش کئے جا سکتے ہیں جنہوں نے آپ کے روبرو مذہب حق اختیار کیا۔ ضیق وقت میں ہم تفصیل سے قاصر ہیں۔ اور جارج سالون کا نام بتا کر اس مقالہ کو ختم کرتے ہیں۔ موصوف نے ۲۵ رجنوری ۱۹۳۸ کو عیسائیت سے تائب ہو کر حقانیت اسلام کا اقرار کیا اور اسلامی نام محمد جعفر تجویز ہوا۔

(ملاحظہ ہو الواعظ فروری ۱۹۳۸ء)

وفات حسرت آیات

۷ رشوال بروز جمعہ مطابق ۱۳ رجولائی صبح کی نماز اور تعقیبات سے فراغت کے بعد سر میں درد کی شدت ہوئی۔ آرام کے لئے لیٹ گئے، ۳۰۔۷ بجے صبح کو کمزوری قلب نے حالت مزاج میں زیادہ تغیر پیدا کر دیا۔ ۱۱ بجے شدید تپ اور غشی شروع ہوئی۔

افسوس ہے کہ یہ آفتاب علم و کمال ۸ رشوال ۱۳۷۰ء کو ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ مرحوم نے پچپن سال کی عمر میں صرف ایک نوجوان صاحبزادہ سید ناصر حسین زیدی فخر الافاضل چھوڑے۔ خداوند عالم زیور صلاح و سداد سے آراستہ کرے۔

(الواعظ جولائی و اگست ۵۱ء)

تصانیف علامہ عدیل اختر ؒ

از شیر تبلیغ جناب مولانا شیخ محمد حمید صاحب قبلہ مرحوم واعظ

۱۔ دعوۃ النظر الی خلافۃ خیر البشر

یہ کتاب استاد مرحوم نے مقام مجنگا مد غا سگر (افریقہ) سے واپس آ کر بحالت قیام پشاور صوبہ سرحد ماہ جون ۱۹۲۶ء میں تالیف کی تھی، مرحوم نے شروع کتاب میں مشہور مسلم کتب حضرات اہل سنت کے نام اور ان کے مصنفین کے اسماء مع سن ولادت و وفات تحریر فرما دیے ہیں۔ نیز سنین طباعت و مطابع کو بھی ظاہر کر دیا ہے۔ جن کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں ان کی شہرت علمی دنیا میں عام ہے۔ دورانِ تحریر جن کتابوں سے حوالہ جات دیے ہیں ان کے صفحات اور سطور بھی بعینہٖ نقل کر دیے ہیں تا کہ کسی انصاف پسند حق بین اور غیر جانبدار ناظر کو تلاش ماخذ میں زحمت و دقت اور سراسیمگی و بے اطمینانی نہ ہو۔ یہ کتاب تقریباً ایک سو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں استاد مرحوم نے مختلف علوم کی روشنی میں بحث امامت و خلافت پر بے نظیر کتاب لکھی ہے۔

۲۔ الا من اکرہ و قلبہ مطمئن بالایمان (مسئلہ تقیہ)

یہ کتاب موضوع تقیہ پر لکھی گئی ہے، حاشیہ پر تحریر ہے کہ اصل رسالہ ۵۲ء میں لکھا گیا۔ بزمانِ قیام آگرہ تبرکاً شہید ثالثؒ کی روح سے استمداد کی غرض سے مزار مقدس کے متصل بیٹھ کر مسودہ نقل کیا جا رہا ہے لہٰذا انہیں کے نام پر معنون کیا جا رہا

ہے۔ ضمیمہ میں مصنفؒ نے ان حضرات سے جو مذہبی مسائل میں راہِ صداقت و حق کے جویا ہیں ان سے خاص طور سے اپیل کی ہے کہ میری کتاب کو بغیر کسی جانبداری کے بہ انصاف از اول تا آخر دیکھا جائے۔ انشاءاللہ پوری تسکین کا باعث ہوگی۔

۳۔ صلۂ تاریخ احمدی

"مصنفہ جناب نواب احمد حسین خان صاحب مرحوم پریانواں" "نواب صاحب مرحوم نے تاریخ احمدی لکھ کر ایک بہت بڑا سرمایہ تاریخ قوم کے سپرد فرمایا تھا۔ جس کو ملک کے ہر گوشہ میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ مختلف موضوعات پر کتب اہل سنت والجماعت سے عبارتیں بجنسہٖ حاشیہ پر منقول ہیں مگر کتاب میں حوالے نہیں ہیں علامہ عدیل اختر ؒ نے حوالے اضافہ فرما کر کتاب کے استحکام میں بے حد کدوکاوش سے کام لیا ہے اور صحیح معنوں میں تاریخ احمدی کے متعلق قوم کی اہم ضرورت کو پورا کر دیا۔ چنانچہ خود استاد مرحوم نے دیباچہ تحریر فرمایا ہے۔

"تاریخ احمدی مؤلفہ جناب شیخ احمد حسین صاحب اپنی خوبیوں کے سبب اس قدر جلد مشہور اور اتنی زیادہ مقبول ہوئی کہ مصنف کی زندگی ہی میں دوبارہ سہ بارہ چھپ کر تشنگان حقائق و طالبان واقعات واقعی کی تشنگی دور کرنے اور اصلیت پر پردہ ڈالنے والوں کی ظلمت کو کافور کرنے میں مسیحائی کا کام کر گئی.....
میں نے اضافوں کو اصل کتاب میں مخلوط نہیں کیا تا کہ مصنف کی محنت نمایاں رہے.....وہ سب اضافے بطور "صلۂ تاریخ احمدی" مناسب مقام کے ساتھ حوالوں کے صفحات کے ہمراہ لکھے اور

کچھ بالکل آخر میں بغرض افادہ بڑھا دیئے۔“

(عدیل اختر مدرسۃ الواعظین لکھنؤ ۳۱ مارچ ۱۹۳۹ء)

۴۔ فلسفۂ اسلام یا علم کلام

یہ کتاب معہ ضمیمہ تقریباً ۱۰۰ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ موضوع خود عنوان کتاب سے ظاہر ہے۔ کافی جد و جہد اور تلاش کے باوجود کتاب کے اول و آخر میں کہیں زمانۂ تصنیف کا پتہ نہیں چلتا۔

۵۔ اصحاب الیمین ما اصحاب الیمین و اصحاب الشمال ما اصحاب الشمال

یہ کتاب علم رجال میں مرحوم نے نہایت سلیس اور آسان طرز پر لکھی ہے اور مختلف مقامات پر جرح و تعدیل کے طریقوں سے روشناس کرایا ہے۔ ماہرین و شائقین فن رجال کیلئے ایک نادر و گرانبہا سرمایۂ علمی چھوڑا ہے۔ زیر نظر کتاب کے آخر میں استاد مرحوم نے ممدوح اصحاب رسول میں بعض حضرات کے حالات معتبر کتابوں سے تحریر فرما دیئے ہیں۔ یہ کتاب ۳ رذی الحجہ ۱۳۲۶ھ مطابق ۷/۱ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی اور تقریباً ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

۶۔ تدلیس شبلی

استاذ علام نے تاریخ یا مناظرہ میں ایسی یادگار چھوڑی ہے جس کے متعلق اکثر وہ خود فرمایا کرتے تھے کہ ”میں نے مولانا شبلی نعمانی کی تالیف کو بخوبی دیکھ کر ایسا جواب دیا ہے کہ جس پر تمام ارباب انصاف کو سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ یہ کتاب بہت مختصر ہونے کے باوجود بھی بڑی گرانمایہ اور مایہ ناز تحقیق علمی کا نچوڑ ہے۔ جو مرحوم کا عصر حاضر میں طرۂ امتیاز تھا۔ یہ کتاب ۱۴ ستمبر ۱۹۳۶ء کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے۔

۷۔ علمی خیانتیں

یہ کتاب کسی فن سے متعلق نہیں بلکہ خود مستقل بالذات یا ایک فن ہے جس پر

اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا خود مرحوم کو اپنی یہ تصنیف محبوب تھی۔ واقعاً انہوں نے اس گرانبہا اور اہم فریضہ سے دیگر علمائے اسلام کو ان کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے۔ مصنف نے آخر میں مقصد کتاب کی وضاحت اس طرح کی ہے:

”اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ جن حضرات کے پاس اس وقت اصلی کتابیں موجود ہیں اُن کی خصوصی حفاظت کریں، جن کے پاس نہیں ہیں وہ جب حاصل کریں تو کوشش کر کے وہ نسخے حاصل کریں جو غیر محرف ہیں اور آئندہ نسلوں کے پاس یہ سند رہے کہ کتابوں میں اس طرح ”علمی خیانت“ کی گئی ہے“

۸۔ تسکین الفتن فی صلح الحسن

امام حسن علیہ السلام کی معتبر اور مدلل تاریخ ہے، سرسری طور پر میں نے بھی اس کتاب کو دیکھا ہے اور مرحوم کے وہ الفاظ بھی اب تک کانوں میں گونجتے ہیں جبکہ یہ فرماتے تھے ”امام حسن علیہ السلام کے واقعات بھی واقعہ کربلا سے کچھ کم نہیں تھے۔“